استحکامِ پاکستان (۲)

○ پاکستان کا عدمِ استحکام: حقیقی یا وہمی

○ پاکستان کی اصل اساس ○ استحکامِ پاکستان کی

وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیرِ مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیمِ اسلامی

۳۶-کے … لاہور

PEPSI

MIRINDA

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۶ / ۲۳۹۳۱

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ــــــ ۳۵

شمارہ ــــــ ۲

فروری : ۱۹۸۶

مطابق

جمادی الاولیٰ : ۱۴۰۶ھ

زرِ سالانہ
۳۰ روپے

فی شمارہ ۳/ روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

چودھری رشید احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی
۳۶-کے۔ ماڈل ٹاؤن
لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

❖ تذکرہ وتبصرہ ——— ۳

——— ڈاکٹر اسرار احمد

❖ حاجی عبدالواحدؒ کا انتقال ——— ۲۶

——— ڈاکٹر اسرار احمد

❖ 'استحکامِ پاکستان' (دوسری قسط) ——— ۳۳

— پاکستان کا عدمِ استحکام: حقیقی وواقعی یا وہمی وخیالی؟

— پاکستان کی اصل اساس

— استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بنیاد

——— ڈاکٹر اسرار احمد

❖ "دل انگندیم بسم اللہ مجریہا و مُرسٰہا" (۴) — ۸۱

——— مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

❖ رپورتاژ (آخری قسط) ——— ۹۷

'ہندوستان میں پندرہ دن'

——— عاکف سعید

سالانہ اجتماعِ تنظیمِ اسلامی

تنظیمِ اسلامی کے مرکزی سالانہ اجتماع کے لئے اِمسال

۴۔ اپریل ۸۶ء بروز جمعۃ المبارک تا ۶۔ اپریل ۸۶ء

کی تاریخوں کا تعین ہوا ہے۔ تنظیم کے تمام رفقاء نوٹ فرمالیں!

المعلن: چوہدری غلام محمد، قیم تنظیمِ اسلامی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

—— اسرار احمد ——

قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں راقم الحروف کی حاضری لگ بھگ پانچ ماہ بعد ہو رہی ہے اِس لیے کہ اگرچہ اکتوبر ۱۹۸۵ء کے پرچے میں بھی مختصر سا 'تذکرہ و تبصرہ' میرا ہی تھا لیکن تفصیلی گفتگو ستمبر ہی کے شمارے میں ہوئی تھی۔

اکتوبر کے شمارے میں راقم نے تحریر کیا تھا:

> "استحکام پاکستان" کے موضوع پر راقم الحروف کی جن تقاریر کا ذکر گزشتہ شمارے میں آیا تھا ان پر محترم اقبال احمد صدیقی صاحب نے بہت محنت کی ہے اور انہیں ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا کام تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر خود ان کا اور بعض دوسرے رفقاء کا اصرار ہے کہ ان پر میں بھی ایک نظر ضرور ڈالوں اور ہو سکے تو انہیں خود اَز سرِ نو مرتب کر دوں، چنانچہ خود میرا ارادہ بھی اب یہی بن گیا ہے، لیکن اس کی تکمیل ظاہر ہے کہ سراسر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اسی کی تائید و توفیق پر منحصر ہے ! بلکہ بمصداق "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے!" کے مصداق میرے دل میں تو یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اگر اللہ حالات سازگار فرما دے تو ماہِ اکتوبر میں عمرہ کے لئے سفر کروں اور اس کے دوران حرم کے کسی گوشے ہی میں بیٹھ کر اس تقریر کو مرتب کروں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!
>
> اس اثنا میں لاہور کی 'شامِ الہدیٰ' والی تقریر کو وڈیو کیسٹ کے ذریعے جن حضرات نے 'دیکھا اور سنا' ہے ان میں سے علماءِ ہند کے خیر آبادی سلسلے کی ایک عظیم شخصیت مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی کے پوتے حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کا جو تاثر موصول ہوا ہے وہ ہدیۂ قارئین ہے۔

اِس وقت یہ عرض کرتے ہوئے حجاب محسوس ہو رہا ہے لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں فضل و کرم ہے کہ وہ کبھی کبھی وہ اپنے عامی و عاصی بلکہ عاجز و ناچیز بندوں کے ساتھ بھی وہ معاملہ فرما لیتا ہے جو اُس کے 'خاص' بندوں کے لیے مخصوص ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جس طرح میری اس خواہش کو پورا فرمایا اُس کا ذکر بفحوائے امرِ ربّانی "وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ!" سپردِ قلم کر رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ میرے قلم سے ماہ ستمبر کی کسی تاریخ کو نکلے ہوں گے۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اُن ہی دنوں حجازِ مقدس سے رفیق مکرم ڈاکٹر شجاعت علی برنی تشریف لے آئے —— انہوں نے جو میری صحت کی

کیفیت دیکھی تو نہایت اصرار کے ساتھ فرمایا کہ کم از کم ایک ماہ 'آرام' کے لیے اُن کے پاس طائف میں میں قیام کروں۔ میری طبیعت میں مزید آمادگی پیدا کرنے کے لیے یہ بھی بتایا کہ وہاں آج کل میرا مکان بالکل خالی ہے اِس لیے کہ مَیں نے اپنے بچّوں کو تعلیم وغیرہ کے لیے اسلام آباد میں SETTLE کر دیا ہے — مَیں نے اُن سے وعدہ کر لیا کہ ایک ماہ تو ناممکن ہے لیکن مَیں پندرہ روز کی کوشش کروں گا۔ میرے دل میں حجاز کے سفر کی خواہش تو پہلے سے تھی ہی۔ مکّہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں چونکہ قیام کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے — اور ہوٹل وغیرہ کا معاملہ بہت مہنگا ہے۔ دوسرے وہاں قیام کی صورت میں احباب رفقاء کی 'دستبرد' سے حفاظت بھی بہت مشکل ہے! لہٰذا خیال آیا کہ یہ صورت جو سامنے آئی ہے۔ یقیناً 'من جانب اللہ' ہے، کہ حرمین کا قرب بھی رہے گا — اور تنہائی اور سکون بھی میسر رہے گا — مزید برآں طائف کی صحت افزا آب ہوا سے بحالیٔ صحت میں بھی مدد ملے گی! گویا 'ہم خرما و ہم ثواب!' کا معاملہ ہوجائے گا!

لیکن اِس کے لیے ضرورت تھی 'وزٹ ویزا' (VISIT VISA) کے حصول کی جو خاصہ مشکل اور دقّت طلب ہوتا ہے۔ پھر میرے پاس مہینہ بھی صرف اکتوبر کا تھا، نومبر میں میرا حیدرآباد (دکن) کے سفر کا پختہ وعدہ تھا جس میں ایک سال کی تاخیر میرے لیے پہلے ہی شرمندگی کی موجب ہو چکی تھی۔

بہرحال برادرِ عزیز اقتدار احمد جو میرے لیے پہلے بھی اپنے ایک سعودی دوست اور سابق کاروباری شریک کے ذریعہ میرے لیے وزٹ ویزا منگوا چکے تھے، اب پھر اُن ہی سے کہا کہ ؏ : "خدا را آں کرم بارِ دگر کُن!" — انہوں نے حامی تو بھر لی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اِس میں کم از کم ایک ماہ تو لگ ہی جائے گا۔ یہ بات میرے لیے مایوس کُن تھی اِس لیے کہ میرے پاس تو کُل ہی ایک ماہ انتظار اور سفر دونوں کے لیے تھا — بہرحال اُن سے یہ کہا کہ کوشش تو کرو۔ پھر جو اللہ کو منظور!!

اب ذرا خدا کا کرنا دیکھئے!

یہ اواخر ستمبر کی بات ہے کہ ۳۰ ستمبر کو کراچی کی 'مشاہم الہدیٰ' کی تقریب منعقد ہونی تھی پی آئی اے سے اس کے لیے کراچی کی بکنگ کرانے کے لیے راقم جب برادرم عبدالرزاق صاحب سے کہہ رہا تھا تو نہ معلوم کیسے دل میں خیال آیا کہ ساتھ ہی روا روی میں جدّہ کے لیے بھی ۱۱ اکتوبر کی تاریخ میں بکنگ کرانے کے لیے کہہ دیا، برادرم اقتدار احمد بھی اُس وقت اتفاقاً موجود تھے۔ انہوں نے فوراً کہا "آپ کس خیال میں ہیں؟ ابھی تو ویزا کے بارے میں کوئی اطلاع تک نہیں ہے اور اطلاع آنے کے

لبد بھی سعودی سفارت خانے والے کم از کم دو ہفتے لگا دیتے ہیں!"، جس پر میں نے کہا" بھائی میرے پاس صرف ۱۱ تا ۲۵ اکتوبر کے دو ہفتے ہیں، اللہ کو منظور ہوا تو ان ہی ایام میں جانا ہو جائے گا، ورنہ ہم بھی استعفیٰ کی رضا پر راضی ہیں!" ـــــ ۳۰ ستمبر کو میں ساڑھے گیارہ بجے کی فلائٹ سے کراچی جانے کے لیے اپنے کاغذات وغیرہ درست کر رہا تھا کہ ایسے ہی خیال آیا کہ برادرم اقتدار احمد سے ویزا کے ضمن میں کسی "اطلاع" کے بارے میں پوچھوں۔ فون کیا تو انہوں نے کہا ابھی چند منٹ میں جن لوگوں کے ذریعے TELEX دیا تھا اُن سے معلوم کر کے بتاتا ہوں، واقعتہً چند ہی منٹ میں اُن کا جواب آگیا کہ کراچی کے سعودی ایئر لائنز کے دفتر کو آپ کے ویزا کے بارے میں "ہدایت، جاری ہو چکی ہے، وہاں فلاں صاحب سے ملاقات کر لیں! گویا "ارادۂ خداوندی" صاف ظاہر ہو گیا تھا! ـــــ اِدھر میری اہلیہ کا پاسپورٹ کسی کام سے پاسپورٹ آفس میں جمع تھا فوراً آدمی بھیج کر اُسے منگوایا اور دونوں پاسپورٹ جیب میں ڈال کر میں کراچی پہنچ گیا۔ وہاں سعودی عرب کے معاملات سے ادنیٰ سی واقفیت رکھنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ یہ "معجزہ" رونما ہوا کہ پیر کی صبح کو پاسپورٹ سعودی ایئر لائنز کے دفتر میں جمع کرائے اور ۲ر کو ویزا مل گیا!!ـــــ درآں حالیکہ راقم نے سعودی قونصل خانہ کی شکل تک نہ دیکھی!

بکنگ اِس سے قبل ہو ہی چکی تھی!ـــــ چنانچہ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ٹھیک ۱۱ر اکتوبر ہی کو جدّہ روانگی ہو گئی۔ ایئر پورٹ پر جدّہ کے رفقاء کے علاوہ ڈاکٹر شجاعت علی برنی بھی موجود تھے اور اگرچہ میں "بظاہر" اُن ہی کی "دعوت" پر پہنچا تھا لیکن وہ خود بھی حیران تھے کہ ایسے چٹ پٹ یہ معاملہ ہو کیسے گیا!ـــــ اُن کی محبت اور تعلق خاطر کا مزید انکشاف اِس طرح ہوا کہ وہ اِس روز ڈیوٹی پر تھے اور صرف ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہنے کے لیے جدّہ آئے تھے چنانچہ وہ تو فوراً ہی واپس طائف چلے گئے۔ ہم نے جمعہ کی نماز جدّہ میں ادا کی اور عصر کے بعد برادرم فیض اللہ خاں کی معیت میں مکّہ مکرّمہ روانہ ہوئے ـــــ عشاء کے وقت تک عمرہ سے فارغ ہو گئے۔ عشاء میں ڈاکٹر برنی طائف سے پھر مکّہ مکرّمہ پہنچ گئے۔ چنانچہ اُن کے ساتھ طائف روانگی ہو گئی!

طائف میں ہفتہ ۱۲ر اکتوبر تا جمعرات ۱۷ر اکتوبر، چھ دن میری زندگی میں بہت طویل عرصے کے بعد نہایت آرام، اطمینان اور سکون کے ساتھ گذرے، چنانچہ ان کے دوران شام کے اوقات میں بھی درس یا خطاب کی صرف ایک دو نشستیں ہی ہوئیں اور ملاقاتیوں کی آمد بھی بہت

کم رہی۔ باقی سارا دن کامل تنہائی ہوتی تھی! ـــــ جمعرات کی شام کو ڈاکٹر صاحب کی معیت میں پھر مکہ مکرمہ کا سفر ہُوا ـــــ شب جمعہ میں دوسرا عمرہ بھی نصیب ہُوا، اور حرم کی رات کے پچھلے پہر کی حاضری بھی! ـــــ برنی صاحب کی نائٹ ڈیوٹی تھی لہٰذا وہ ہمیں مکہ مکرمہ چھوڑ کر واپس طائف چلے گئے تھے لیکن جمعہ کی نماز میں پھر تشریف لے آئے اور شام کو اُن کی معیت میں واپسی ہوگئی اور مزید چار دن طائف میں گذرے، لیکن ان آیام میں ملاقاتوں اور دعوتوں کا چکر بھی زوردار چل نکلا ـــــ اور دروس و خطابات بھی تقریباً روزانہ جاری رہے ـــــ

بہرحال! اللہ تعالےٰ نے وہ ارادہ پورا کرادیا جس کے لیے اس سفر کی خواہش پیدا ہوئی تھی ـــــ اور 'استحکامِ پاکستان' کے ضمن میں مقدمہ اور چند ذاتی وضاحتیں' کے علاوہ ابتدائی تین ابواب بھی ضبطِ تحریر میں آگئے، فلہ الحمد والمنۃ!

ان میں سے 'مقدمہ' بعنوان "پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال" اور اس کی دینی و تاریخی اہمیت" اور "چند ذاتی وضاحتیں" گذشتہ شمارے میں قارئین کی نگاہ سے گذر چکی ہیں ـــــ تین ابواب پیشِ نظر شمارے میں شامل ہیں!

سعودی عرب سے بجائے ۲۵ کے ۳۱ اکتوبر کو واپسی ہوئی تھی۔ نومبر کی ابتدائی تاریخوں میں تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کا سہ ماہی اجلاس منعقد ہُوا تھا۔ اُس میں طے ہُوا کہ ان مضامین کو 'میثاق' میں باکتابی صورت میں شائع کرنے سے قبل ہی ملک کے کسی کثیر الاشاعت روزنامے کے ذریعے عوام الناس کے سامنے لایا جائے۔ چنانچہ روزنامہ 'جنگ' سے بات ہوئی اور الحمد للہ ۲۹ نومبر ۸۵ء سے پاکستان کے اس کثیر الاشاعت روزنامے کے بیک وقت کراچی، لاہور، راولپنڈی اور کوئٹہ کے جمعہ ایڈیشن میں ان مضامین کی قسط وار اشاعت کا آغاز ہوگیا ـــــ اس سے جہاں یہ مقصد حاصل ہوگیا کہ ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوگئی وہاں ایک اضافی حکمت، جو بعد میں ظاہر ہوئی وہ یہ کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید میری اُن شدید مصروفیات کی بنا پر جن کا زوردار چکر سعودی عرب سے واپسی کے فوراً بعد شروع ہوگیا تھا۔ بقیہ کتاب کی تحریر کا کام کھٹائی میں پڑ جاتا۔ لیکن اب چونکہ اخبار میں اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے تو پابندی کرنی پڑ رہی ہے۔ (ورنہ واقعہ یہ ہے کہ "نغمہ کجا و من کجا!" کے مصداق کہاں میں اور کہاں پابندی کے ساتھ 'لکھنا'!!) چنانچہ ماہ جنوری میں الحمد للہ کہ کتاب کے تین مزید ابواب ضبطِ تحریر میں آچکے ہیں! ـــــ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ ان مضامین کو ملک و ملت کے

مستقبل کے لیے مفید، اور میرے لیے توشۂ آخرت بنادے، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ!

جن حضرات کو ان مضامین میں افادیت کا کوئی پہلو نظر آئے یہ اُن کی ذمہ داری ہے کہ اُن کی زیادہ سے زیادہ وسیع حلقے میں اشاعت کے لیے کوشاں ہوں۔ اِس ضمن میں اُن کی توجہ کے لیے دو باتیں عرض ہیں (۱) اپنے احباب اور جاننے والوں کے حلقے میں سے زیادہ سے زیادہ حضرات کو جنوری ۱۹۸۶ء کی اشاعت سے 'میثاق' کے سالانہ خریدار بنوائیں۔ اسی غرض سے جنوری کی اشاعت بھی معمول سے قدرے زائد تعداد میں طبع کرالی گئی تھی اور پیشِ نظر شمارہ کے ضمن میں بھی یہ اہتمام ہوجائے گا۔
(۲) "پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال" ایک پمفلٹ کی صورت میں علیحدہ بھی طبع کرالیا گیا ہے۔ کتاب کے موضوع سے متعارف کرانے کے لیے اِس کی وسیع حلقے میں اشاعت مفید ہوگی۔ یہ کتابچہ دفتر 'میثاق' سے پچاس روپے سینکڑہ کے حساب سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

اِس ضمن میں یہ اطلاع بھی مناسب ہے کہ اس کتاب کا مکمل نام:

"استحکامِ پاکستان کا واحد ذریعہ: اسلامی انقلاب!"

ہوگا راقم جملہ قارئین 'میثاق' سے استدعا کرتا ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں۔

سعودی عرب کے سفر کی چونکہ کوئی روداد شائع نہیں ہوسکی، لہٰذا صرف ان امور کا ذکر انشاءاللہ دلچسپی کا موجب ہوگا کہ منگل ۲۲ اکتوبر کو طائف ہی سے بذریعہ ہوائی جہاز مدینہ منوّرہ حاضری ہوئی تھی اور روضۂ مطہرہ پر حاضری کے ساتھ ساتھ ایک جمعہ بھی مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں نصیب ہوگیا تھا۔ وہاں سے جمعہ ۲۵ اکتوبر کو نمازِ جمعہ کے فوراً بعد برادرم محمد حنیف اختر صاحب کے ساتھ بذریعہ کار بھاگم بھاگ، جدّہ واپسی ہوئی، جہاں اسی رات کو بعد نمازِ عشاء جامع مسجد عمر ابن الخطّاب رضؓ واقع شارع ستین (نزد مطارِ قدیم) میں ایک باقاعدہ 'جلسۂ عام' میں خطاب ہُوا جس کی حاضری سعودی عرب کے حالات کے پیشِ نظر نہایت غیر متوقع (سات آٹھ سو کے لگ بھگ) تھی۔ مسجد کے خطیب ایک مصری عالم ہیں اور متولّی ایک نہایت نیکدل عرب سعودی شیخ، تقریر اردو میں تھی اور اس کا عنوان بھی "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟" تھا۔ لیکن چونکہ کثرت سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کا حوالہ تھا لہٰذا اندازہ یہ ہُوا کہ تقریر کے پورے مضمون کو اِن حضرات نے خوب سمجھا۔ خطیب صاحب

نے تو بعد میں صدارتی خطبہ کے انداز میں نہایت سادہ و سلیس لیکن حد درجہ فصیح و بلیغ عربی میں جو کچھ فرمایا اُس کا تذکرہ اِس لیے مناسب نہیں کہ میرے قلم سے وہ 'مدح خود' کا مصداق بن جائے گا۔ سُنے صاحب تو ان کے احساسات و جذبات اُن کی پُر تکلف دعوتِ طعام اور اُس کے دوران اُن کے ہر بُنِ مُو سے پھوٹنے والی محبت سے ظاہر ہو گئے تھے !!

سعودی عرب میں مقیم پاکستانی اور ہندی مسلمانوں کے حلقے میں ایک نئی تبدیلی کی خبر گذشتہ سال رمضان المبارک کے فوراً بعد برادرم ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا دے چکے تھے کہ جب وہ عشرۂ اخیرہ میں عمرے کے لیے گئے تو بقول اُن کے "اِس بار وہاں ایک نئی بات یہ شدت کے ساتھ محسوس ہوئی کہ بہت زیادہ تعداد میں لوگوں نے آپ کی صحت و عافیت اور تنظیم اسلامی کے کام کے بارے میں دریافت کیا!" میں نے اِسے اتفاقی سی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن اِس سفر کے دوران اِس کا خود مجھے شدت کے احساس ہُوا۔ اور اِس کی توجیہہ یہ سمجھ میں آئی کہ ایک تو سعودی عرب کی حکومت نے بھی کچھ اپنی پالیسی بدل لی ہے۔ اور غیر سعودی لوگوں کے اجتماعات وغیرہ کے ضمن میں زیادہ تشویش کا اظہار نہیں کرتی (البتہ اُن میں سعودی شہریوں کی شرکت پر بہت چوکنی ہو جاتی ہے!) لہٰذا اب دینی مذہبی اجتماعات اور تقریبات زیادہ آزادی سے منعقد ہو رہی ہیں، اسی بنا پر یہ چرچا اور دلچسپی ہے — دوسرے یہ کہ اب اکثر لوگ جان گئے ہیں کہ عنقریب یہاں سے کوچ اور وطن واپسی ہوگی۔ لہٰذا پاکستان کے حالات کے بارے میں لوگ پہلے سے زیادہ غور و فکر کر رہے ہیں — واللہ اعلم! بہر حال اِس مرتبہ جتنی تعداد میں لوگ جدہ، طائف اور ریاض میں تنظیم میں شامل ہوئے، اس سے بھی رندھاوا صاحب کے رمضان مبارک والے 'مشاہدے' اور میرے متذکرہ بالا 'تجزیے' کی تائید ہوتی ہے!

بہر حال! جدہ میں ایک بھر پور نشست سوال و جواب کی بھی ہوئی اور اتوار، ۲۷ اکتوبر کو وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے الریاض جانا ہُوا۔ جہاں ڈھائی دن نہایت شدید مصروفیت میں گذرے مردوں کے دو بھر پور اجتماعات کے ساتھ ساتھ ایک اجتماع خواتین کا بھی منعقد ہُوا۔ حسبِ معمول ایک پُر تکلف دعوتِ طعام ڈاکٹر محمد عمر چھابڑہ صاحب کے مکان پر ہوئی۔ پروفیسر جلیل الدین احمد اور دوسرے دوسرے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات سے تفصیلی گفتگوئیں ہوئیں اور متعدد ہندی و پاکستانی حضرات نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی! — وہاں سے ۳۰ اکتوبر کو علی الصبح رفیق مکرم عطاء الرحمٰن صاحب کی کار میں ان کی اور برادرم عظیم الدین خاں کی معیت میں دمام اور الخبر جانا

ہُوا۔ جہاں محترم ملک عبّاس نے اپنے سکول میں دعوتِ طعام کے ساتھ کافی بڑا استقبالیہ ترتیب دیا ہُوا تھا۔ وہیں رات کو بعد نماز عشاء پبلک جلسہ بھی ہوا۔ یہاں پچھلے سال بھی ایک بڑا جلسہ ہُوا تھا جس میں سیرت النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے موضوع پر خطاب ہُوا تھا۔ اس بار وہاں بھی براہِ راست پاکستان کے قومی اور ملّی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اس جلسے کی جو رپورٹ اور تقریر کا جو خلاصہ روز نامہ نوائے وقت کے نمائندے طارق نسیم صاحب نے اپنے روز نامے کو ارسال کیا اور جو نوائے وقت کراچی کی اشاعت بابت ۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا وہ حیرت انگیز حد تک صحیح ہے۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے شرکاء کی تعداد ’ہزاروں‘ بیان کی ہے جبکہ میرے اندازے میں وہ ایک ہزار سے کچھ ہی زائد ہوں گے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ تعداد بھی وہاں کے اعتبار سے واقعتاً بہت غیر معمولی ہے! ملاحظہ فرمائیے:

ڈاکٹر اسرار احمد کے سعودی عرب کے تبلیغی دورے کی رپورٹ

پاکستان کے ممتاز مفکر و عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد نے اسلامی انقلاب کو ملکی سالمیت و بقا کے لئے لازم قرار دیتے ہوئے نوجوانوں کو تلقین کی ہے کہ اسلام کے سماجی و اقتصادی انصاف پر مبنی نظام کے لئے راہ ہموار کریں اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ وہ گزشتہ دنوں الخبر، سعودی عرب میں پاکستانی کمیونٹی ہائی سکول و کالج کے کمیونٹی سینٹر میں اسلام اور پاکستان کے موضوع پر لیکچر دے رہے تھے۔ طلبہ، والدین اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں پاکستانیوں نے اس لیکچر میں شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے پاکستان کے سیاسی و جغرافیائی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ چند برسوں میں اسلامی انقلاب بپا نہ ہوا تو خدانخواستہ ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا اور سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے المیے کے بعد مغربی پاکستان کے بھی حصے بخرے ہونے کا احتمال ہے۔ انہوں نے اسلامی انقلاب کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ انقلابی عمل میں اسلامی انقلابی نظریات کی اشاعت، اس کی دعوت قبول کرنے پر تنظیم، بعد ازاں انہی خطوط پر تربیت اور پھر عدم تشدد کے ذریعے فرسودہ نظام کے خلاف مزاحمت تاکہ مطلوبہ قوت کی فراہمی تک اس کے خلاف نفسیاتی و ذہنی جنگ کے بعد آخری مرحلے یعنی چیلنج کے لئے تیاری کی جا سکے جہاں اس نظام کی دکھتی رگ پر نشتر چلا کر واضح برتری کے ساتھ کامیابی حاصل کی جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ عالمی تجزیہ نگاروں کی رائے میں پاکستان آج بھی اپنے تشخص کی تلاش میں ہے کیونکہ پاکستان صرف اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا جس سے اب تک عوام کو محروم رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ماضی کی غلطیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا اگر ہم وطن، قومیت، بنا، اساس اور دین کے طور پر اسلام کو منتخب کرتے تو ہمارا ملک بھی مضبوط ہوتا، قوم بھی سربلند ہوتی اور دین میں بھی بہار آتی۔ انہوں نے قومیت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نسلی، لسانی یا علاقائی بنیاد پر قائم نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا جواز صرف اسلام تھا۔ انہوں نے دیگر ممالک کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان نسلوں کی چوں چوں کا مربہ ہے، عربوں کے نیشنلزم کی بنیاد لسان عربی ہے جبکہ پاکستان میں لسانی قوم پرستی وجود میں نہیں آ سکتی اور نہ ہی وطنی قومیت کے تصور کو نافذ کیا جا سکتا ہے کیونکہ وطن سے مراد عام طور پر علاقہ لیا جاتا ہے جبکہ مسلمان وطن کی حدود کا قیدی نہیں ہوتا، اس کے تحت الشعور میں ضمیر کا تقدس برقرار رہتا ہے اور وہ وطن کو دیوتا بنانے کے تصور سے دور رہتا ہے کیونکہ بقول اقبال

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس طرح ہمارا وطن آفاقی ہے اور ہر مسلمان آفاقیت کا قائل ہے جس کی سب سے بڑی مثال تحریک خلافت ہے جس کی حمایت سب سے پہلے اور سب سے زیادہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے کی تھی حتیٰ کہ سیاسی موت سے بچنے کے لئے گاندھی کو بھی اس تحریک کی حمایت کا اعلان کرنا پڑا۔ اس طرح نسلی یا قومی وطنیت کا تصور مسلمان کے لئے غلط ہے، اگر پاکستان میں زمین کے تصور پر قومیت کا دارومدار ہوتا تو سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی قومیں زیادہ قوت سے ابھر کر سامنے آئیں کیونکہ ان کے لئے لسانی، ثقافتی و معاشرتی مددگار عوامل موجود ہیں۔ بھارت میں بھی صرف علاقائی نیشنلزم ہے لیکن ان کے سیاسی ادارے منظم ہیں جن کی بنیاد سیکولرازم پر ہے، یہی وجہ ہے کہ ہند و پاک تنازعہ ہو تو بھارتی مسلمانوں کی دلی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہوتی ہیں کیونکہ مسلمان بنیادی طور پر آفاقیت کا قائل ہے۔ علاقائی و لسانی تعصب کی نفی پر ہم نے پاکستان بنایا تھا کیونکہ لسانی قومیت، نسلی قومیت اور وطنی قومیت کے تصورات ہمارے مزاج کی ساخت سے مطابقت نہیں رکھتے جبکہ یہ تقسیم در تقسیم کو تقویت

دینے والے عوامل ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس وطنی سہارا نہیں جبکہ دیگر مسلم اقوام بالخصوص ترک اور عرب وغیرہ کے لئے تاریخ اسلام کے حوالے سے حب الوطنی کے لئے علاقائیت بھی موجود رہی ہے۔ اس لئے ہمیں حقائق کا تجزیہ منطقی انداز میں درست طور پر کرنا چاہئے تب ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مسلمان میں آج جو چیز مشقت ' محنت اور ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے وہ قومی نہیں حقیقی اسلام ہے جسے ہر شخص دل کی گہرائیوں سے محسوس کرے اور اس جذبے کو حاصل کر لینے سے کوئی طاقت پاکستان کو آنچ نہیں پہنچا سکتی نیز یہ جذبہ لسانی 'نسلی یا وطنی قومیت کی بنیاد پر پیدا نہیں ہو گا بلکہ حقیقی اور عملی جذبے کی بنیاد پر ہو گا جس کی صداقت کی گواہی ضمیر کی آواز دے کیونکہ محض مسلمان ہونا کافی نہیں 'اسلام کی حقیقی روح کے ساتھ اسے قبول کرنا لازم ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان کی سالمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام ہی اس ملک کی بقاء با عزت اور باوقار دوام کی ضمانت دے سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انتخابات کے راستے اسلام نہیں لایا جا سکتا اور نہ ہی مارشل لاء اس مسئلے کا حل ہے۔ انتخابات کو انہوں نے ملک کو زندہ رکھنے کے لئے لازمی قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ سیاسی عمل کا ایک حصہ ہیں لیکن اسلام کا نعرہ لگا کر ووٹ مانگنے سے فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ انہوں نے متعدد سیاسی پارٹیوں کا حوالہ دیا جو اسلام کے نفاذ کی بابت مخلص اور سنجیدہ ہیں لیکن انہوں نے اس امر سے اختلاف کیا کہ انتخابات سے مطلوبہ ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے انتخابات کو بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے سے تعبیر کرتے ہوئے قرآن حکیم کی سورہ رحمٰن آیت نمبر ۱۶ کا حوالہ دیا کہ اگر تم زمین پر بسنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ انتخابات میں اسلام کا نعرہ لگانے سے مختلف مذہبی جماعتوں کی جانب سے فروعی اختلافات کو ہوا دی گئی کیونکہ ہر جماعت اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لئے ڈٹی رہی۔ اس لئے ملک کو زندہ رکھنے کے لئے الیکشن کی ضرورت ہے جبکہ مسلمان بننے کے لئے ایمان چاہئے اور یہ ایمان انقلابی عمل سے آ سکتا ہے۔ انہوں نے اسلامی انقلاب کے بعد سوشیو اکنامک نظام متعارف کرانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس نظام کے تحت ملک میں سماجی انصاف ہو گا جس میں اونچ نیچ کی بنیاد صرف تقویٰ ہو۔ قرآن کے مطابق معاشی عدل ہو جس کے تحت حکومت کفالت اور ذمہ داری قبول کرے اور یہی نظام حکومت ملت کے لئے رسول کریم ﷺ نے تجویز کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لیکچر کے اختتام پر حاضرین کو سوالات کے جوابات بھی دیئے۔

پاکستانی کمیونٹی کے روح رواں عباس حسین ملک نے لیکچر سے قبل ڈاکٹر اسرار احمد کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں ممتاز پاکستانیوں نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر نمائندہ نوائے وقت سے انٹرویو میں ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی تنظیم اسلامی کے بارے میں پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ ۱۰ برس کی کوشش سے ایک ہزار افراد نے رکنیت حاصل کی ہے جس میں زیادہ تر نوجوان طبقہ ہے جبکہ سرکاری ملازمین بھی پروگرام سے متفق ہیں البتہ تاجر برادری معاشی عدل و انصاف کے پروگرام سے خائف ہے۔ فروعی اختلافات ختم کرنے کے بارے میں کوششوں سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ فرقوں کی رجسٹریشن کر کے ان کی مساجد مخصوص کر دی جانی چاہئیں جن میں دوسرے فرقے مداخلت نہ کریں اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔ جمہوریت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں محدود جمہوریت کے قائل ہیں۔ خواتین کے لئے پابندیوں سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ خواتین کی ملازمت کے خلاف نہیں بلکہ پابندی آ داور مخلوط ماحول پر ہونی چاہئے۔ عورتوں کو علیحدہ کاٹیج انڈسٹریز میں ایسی ملازمتیں مہیا کی جائیں جن میں صرف خواتین ہی ہر شعبے میں کام کریں اسی طرح فضائی سروس اور ہسپتالوں میں سے خواتین کو ہٹایا جائے۔ خواتین نرسز کو صرف نسوانی ہسپتالوں میں متعین کیا جائے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ پاکستان میں خواتین زیادہ اسلام پسند ہیں اور اس امر پر ریفرنڈم کرایا جا سکتا ہے چند مغرب زدہ خواتین کے مظاہروں کی کوئی اہمیت نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خواتین کی کھیلوں کے بھی خلاف نہیں لیکن یہ کھیلیں صرف انہی اداروں میں ہونی چاہئیں جس میں بے پردگی نہ ہو۔ کرکٹ پر پابندی کے بارے میں ان کے سابقہ مطالبہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ طویل المدت کھیلوں سے عوام کے وقت کا ضیاع ہوتا ہے اس لئے قوم ایسی عیاشی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ سعودی عرب میں تارکین وطن کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ انہیں کیمپوں میں ہندوؤں کے ساتھ یا ہندو باورچیوں کا تیار کردہ کھانا برداشت کرنا پڑتا ہے جس پر متعدد بار پاکستانیوں کو ناگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ غیر اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کی ممانعت ہے اس لئے مسلمانوں کو احتیاط کرنی چاہئے۔

تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستانی کمیونٹی کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے طائف ' جدہ ' ریاض اور الخبر میں تارکین وطن کو مختلف موضوعات پر لیکچر دیئے تھے۔ اختتامی تقریب میں انہوں نے پاکستانی سکول کے چیئرمین ملک عباس حسین کے جذبہ اسلامی کو سراہا اور میزبانی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

الغرض! —— ارضِ مقدس کا یہ پورے بیس روز کا دورہ بفضلہ تعالیٰ ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا ' الخبر ' کے کمیونٹی سنٹر سے فارغ ہوتے ہی ظہران ایئر پورٹ کے لیے روانگی ہوئی جہاں سے رات کے ایک بجے کے لگ بھگ روانہ ہو کر جمعرات ۳۱ را کتوبر کو علی الصبح براہِ راست لاہور واپسی ہو گئی ——

بسم اللہ ولجنا وعلیہ ربنا توکلنا!!

نومبر اور دسمبر ۱۹۸۵ء کے دو مہینے پھر شدید ترین مصروفیت میں گذرے۔ ملاحظہ فرمائیں!

یکم نومبر کو جمعہ تھا ــــ مسجد دارالسلام میں خطاب جمعہ بھی ہوا، اور شام کو حسب معمول واپڈا آڈیٹوریم لاہور میں "شام الہدیٰ" کی ماہانہ نشست بھی!

۲ و ۳ر نومبر: اجلاس مرکزی مجلسِ مشاورت تنظیم اسلامی

۴ر نومبر: درس قرآن، کمیونٹی سنٹر، اسلام آباد

۵ر نومبر: تقریر گورنمنٹ کالج، رحیم یار خاں

۶ر نومبر: خطاب تقریبِ نکاح (خواہرزادیٔ خود) صادق آباد

۶ و ۷ر نومبر: کی درمیانی شب، رحیم آباد برائے ملاقات سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری مدظلہ

۷ر نومبر: تقریر بر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ــــ سیرت کانفرنس سکھر۔ زیر اہتمام تنظیم فکر و نظر سندھ (اور جلسے سے براہ راست بھاگ دوڑ کر کے رات کے بارہ بجے روہڑی سٹیشن سے خیبر میل میں سوار)

۸ تا ۱۰ر نومبر: علاقائی اجتماع حیدرآباد سندھ

۱۱ر نومبر: "شامِ الہدیٰ" تاج محل ہوٹل، کراچی

۱۴ر نومبر: تقریر سول سروس اکیڈمی لاہور

۱۵ر نومبر: خطاب جمعہ ــ و خطاب عام جامع مسجد باغ والی، بیرون شاہ عالمی دروازہ لاہور۔

۲۰ تا ۲۵ر نومبر: دہلی

۲۶ر نومبر تا یکم دسمبر: حیدرآباد (دکن)

یکم تا ۳ر دسمبر: ــــ پھر دہلی،

۴ر دسمبر: دہلی سے واپسی،

۵ر دسمبر: تقریر نیشنل ڈیفنس کالج، راولپنڈی،

۶ر دسمبر: خطاب جمعہ و "شامِ الہدیٰ" لاہور

۹ تا ۱۹ر دسمبر: ابوظہبی۔

۲۰ر دسمبر: جمعہ، صبح کی فلائٹ سے کراچی سے لاہور، خطاب جمعہ مسجد دارالسلام

۲۲ر دسمبر: واپس کراچی، رات کو تقریر بر سیرت النبیؐ، لانڈھی

۲۳ر دسمبر: "شامِ الہدیٰ" کراچی

۲۴ر دسمبر: "تقریر" پاکستان میں اسلامی انقلاب، کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟"، کورنگی کراچی۔

۲۵ دسمبر: مفصّل نشست سوال و جواب، کورنگی

اِس کے بعد سے آج کی تاریخ (۲۳ جنوری ۸۶ء) تک بس صرف ۶ جنوری کو اسلام آباد کے ماہانہ پروگرام کے لیے جانا ہُوا جہاں سے ۷ ہی کو واپسی ہو گئی تھی۔ اِس عرصے میں کچھ تو گذشتہ تین مہینوں کی شدید ترین مصروفیت کی تکان اُتری ــــ اور کچھ الحمدللہ کہ "استحکامِ پاکستان" کے تین ابواب ضبطِ تحریر میں آ گئے! ــ جن میں سے ایک جمعہ ۷ جنوری کے "جنگ" میں شائع ہو چکا ہے، دوسرا ان شاء اللہ کل ۲۴ جنوری کو شائع ہو جائے گا اور تیسرا دو اقساط میں آئندہ شائع ہو گا ــ!!

اب ۲۷ کو کراچی اور حیدرآباد کے پانچ روزہ دورے کے لیے روانہ ہونا ہے۔ پھر ۲ فروری کو پشاور اور ۳ کو اسلام آباد کا پروگرام ہے ــــ لیکن تحت الشعور میں سخت تشویش ہے کہ محاورے کے مطابق "جمعہ جمعہ آٹھ دن" ہوتے ہیں، لیکن مجھے آج کل ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے روز ہی جمعہ آ جاتا ہے اور اگلی قسط کی تلوار سر پر لٹکنی شروع ہو جاتی ہے ــ بہرحال سہارا اسی بات کا ہے کہ اب تک یہ سارا کام اُسی نے کرایا ہے ــــ آئندہ بھی وہی کرائے گا!

بیرونی دوروں میں سے سفرِ ہند کی روداد عزیزم عاکف سعید لکھ ہی رہے ہیں، ابوظہبی کی روداد اِن شاء اللہ رفیقِ مکرم جمیل الرحمٰن صاحب لکھیں گے، لہٰذا اِس کے ضمن میں بھی کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں! سوائے اپنے اِس تأثر کے کہ ابوظہبی میں مجھے ایک نہایت خوشگوار حیرت کا سامنا ہُوا ــ اِس لیے کہ میرے آج تک کے بیرونِ پاکستان کے تمام دوروں کے دوران جن کا آغاز ۱۹۷۹ء کے سفرِ امریکہ سے ہُوا تھا آج تک کہیں کوئی پروگرام اِس قدر بھرپور، اتنا پیشگی مرتب شدہ (PRE-PLANNED) اتنا منظم (WELL-ORGANISED) اتنی خوبصورتی اور باقاعدگی کے ساتھ چلایا جانے والا (WELL-CONDUCTED) اور اِن سب باتوں کے نتیجے میں اتنا کامیاب اور نتیجہ خیز ــــ (PRODUCTIVE) نہیں رہا جتنا ابوظبی کا یہ دس روزہ پروگرام! (اِس کے آس پاس اگر کوئی پروگرام آتا ہے تو وہ صرف ۱۹۸۹ء کا ٹورنٹو (کینیڈا) کا پروگرام تھا۔ لیکن وہ بھی بہرحال نمبر ۲ پر ہے!) اِس کی وجہ چند نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہمارے موجودہ معیارات کے اعتبار سے "طبقۂ اعلیٰ" سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی "اجتماعی محنت" (TEAM WORK) ہے، ــــ اللہ تعالیٰ اُن کی اِس محنت کو حسنِ قبول سے سرفراز فرمائے! آمین یا ربّ العٰلمین!

حُسنِ اتفاق سے میرا مفصل "تذکرہ و تبصرہ" بھی ستمبر ۸۵ء کی اشاعت کے بعد اب شائع ہو رہا ہے اور عزیز مکرم مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب کے "دل افگندیم" کا آغاز بھی ستمبر ۸۵ء سے ہُوا تھا اور پیشِ نظر شمارے میں اس کی تکمیل ہو رہی ہے!

اِس عرصہ میں اُن کی جو طویل تحریر پانچ اقساط میں "میثاق" میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ جو دوسرے مضامین "میثاق"، اور "حکمتِ قرآن" میں شائع ہوئے ـــــ اور اُن پر مستزاد اُن کی بعض دوسری تحریریں جو ملک کے دوسرے جرائد میں شائع ہوئیں اُن سب کے ضمن میں کچھ سوالات، کچھ اعتراضات کچھ تنقیدیں اور کچھ تردیدیں راقم الحروف تک تحریراً یا زبانی پہنچتی رہیں ـــــ ان سب کے جواب میں راقم نے مسلسل چھ ماہ تحریراً تو مکمل سکوت اختیار کیے رکھا اور زبانی صرف یہ عرض کرنے پر اکتفا کی کہ نہ یہ لازم ہے کہ وہ میری صد فی صد باتوں سے متفق ہوں، نہ ہی یہ ضروری ہے کہ مجھے اُن کے جملہ خیالات و آراء سے کامل اتفاق ہو۔ اِس وقت اِس مسئلے پر کچھ وضاحتیں پیش کرنے کے ارادے سے خود اپنی اگست ۸۵ء کی تحریر (شائع شدہ "میثاق" ستمبر ۸۵ء) پر نظر ڈالی تو بے اختیار قلب کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے شکر کے جذبات و احساسات اُبھرے کہ اُس نے راقم کے قلم سے اُسی وقت نہایت جامع بات نکلوا دی تھی۔ کاش کہ تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن میں شامل میرے جملہ رفقاء و احباب، اور میرے اور تنظیم کے ناقدین و معترضین کے علاوہ دین کے جملہ خادمین و مخلصین ان گذارشات پر کماحقہٗ توجہ فرمائیں، طوالت کے خوف کے باوصف یہ طویل اقتباس فوری مراجعت کے لیے حاضر ہے:

> سعید الرحمٰن علوی صاحب کے معاملے کو راقم نے خصوصی اہمیت اس لئے دی ہے کہ تعلیمی، دینی اور سیاسی پس منظر کے اعتبار سے میرے اور اُن کے مابین بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جانب اسکول و کالج کی تعلیم اور دوسری جانب حفظ قرآن اور درسِ نظامی کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی کہاں اوّلاً تحریک پاکستان اور ثانیاً جماعتِ اسلامی سے ذہنی اور قلبی بلکہ فعّال عملی تعلق اور کہاں ابتداءً مجلسِ احرارِ اسلام اور بعد ازاں جمعیتِ علماء اسلام سے والہانہ وابستگی ـــــ اسی طرح کہاں اُن کا بقولِ خود "متعصّب حنفی" ہونے کا معاملہ اور کہاں راقم کا یہ موقف کہ نہ وہ سکۂ بند حنفی ہے نہ عرفِ عام کے مطابق اہلحدیث بلکہ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ مسلک ولی اللّٰہی سے منسلک ہے! گویا اسے ہر اعتبار سے اجتماعِ ضدّین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن راقم کے نزدیک یہ ایک نہایت نیک فال اور اعلیٰ مثال ہے جو ان شاء اللہ العزیز "قرآن السعدین" کی تمہید بنے گی۔ اس لئے کہ اگر احیاء و اقامتِ دین کے بلند و بالا اور اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لئے مختلف فقہی مسالک اور رُوحانی سلاسل سے منسلک اور ماضی کی شخصیات اور تحریکات کے

ضمن میں کس قدر مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے لوگ اُس شان کے ساتھ جمع ہوں جس کا نقشہ قرآنِ حکیم کے حسبِ ذیل الفاظ میں سامنے آتا ہے۔:

"تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ"

تو امید کی جا سکتی ہے کہ مختلف مسالک اور مکتبہ ہائے فکر و نظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مابین فاصلوں میں کمی آئے گی اور ذہنی و قلبی قرب پیدا ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اجنبیت کے حجابات اور فکری و جذباتی بُعد اور "من دیگرم تو دیگری" کی کیفیت کے تشویشناک اور مایوس کن حد تک بڑھ جانے کا اصل سبب یہ ہے کہ ہر گروہ اور ہر طبقہ بقول "اپنے ہی حُسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں" کے مصداق اپنے ہی حلقے کے بزرگوں کی محبّت و عقیدت سے سرشار، اپنے ہی مسلک کی مطبوعات و جرائد کے پڑھنے پڑھانے اور اپنے ہی مخصوص فکر کے تانے بانے میں ایسا گم رہتا ہے کہ دوسروں سے تعارف اور واقفیت کی نوبت ہی کبھی نہیں آتی۔ نتیجۃً "كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" کی کیفیت کی شدت اور اس کی گہرائی و گیرائی ہی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے! اسی صورتِ حال میں تبدیلی کی ایک کوشش تھی جو راقم الحروف گذشتہ تیرہ سال سے کرتا چلا آرہا ہے یعنی قرآن کانفرنسوں اور قرآنی محاضرات کے پلیٹ فارم پر مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر کے اصحابِ علم و فضل کو جمع کیا جائے تاکہ ذہنی اور قلبی فاصلے کم ہوں اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور سننے کے مواقع میسر ہوں —— اور راقم کو اللہ کے اُس خصوصی فضل و کرم سے امید واثق ہے جو اُس کے اس حقیر اور عاجز و ناتواں بندے کے شاملِ حال ہے کہ ان شاء اللہ العزیز اس کی قائم کردہ تنظیم کے ذریعے مختلف ذہنی و فکری پس منظر کے حامل، مختلف مسالکِ فقہیہ سے وابستہ اور ماضی کی مختلف سیاسی تنظیموں اور تحریکوں سے تعلق رکھنے والے لیکن دین کا درد رکھنے اور اُس کی غیرت پر کڑھنے والے اور اُس کی نصرت و اقامت کے لئے تن من دھن لگا دینے کا عزم رکھنے والے لوگ ایک مضبوط تنظیمی سلسلے اور محکم جماعتی رشتے کے "بُنیانِ مرصوص" میں منسلک ہو کر "حزب اللہ" کی صورت اختیار کرلیں گے! وما ذالك على الله بعزيز!!

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی وضاحت ہو جائے تو مناسب ہے کہ اس کا امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس صورت میں کہ تنظیم کی اساس شخصی بیعت پر ہو نہ کہ کسی دستوری یا جمہوری ڈھانچے پر —— اس لئے کہ موخر الذکر صورت میں تنظیمی فیصلوں اور مناصب کی تفویض کے جملہ معاملات "ووٹوں کی گنتی" کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں لہذا منطقی طور پر لازمی ہے کہ "ووٹ" کا حق صرف اُن لوگوں کے پاس ہو جن کے کسی خاص مکتبۂ فکر اور نقطۂ نظر سے کامل ہم آہنگی اور اصول اور

کلیات ہی نہیں فروعات اور جزئیات تک کے بارے میں ذہن و مزاج کے ایک مخصوص رُخ پر ڈھل جانے اور ایک خاص رنگ میں رنگے جانے کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کر لیا گیا ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر و نظر میں کسی وسعت کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا بلکہ اُس خاص ذہن و مزاج ہی کے پختہ سے پختہ تر اور شدید سے شدید تر ہونے کا عمل جاری رہتا ہے جس سے لامحالہ تنگ نظری، گروہ پرستی اور تحزّب و تعصّب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے ——— جبکہ شخصی بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم میں باہمی مشاورت کی فضا تو بتمام و کمال برقرار رہتی ہے یا رہ سکتی ہے لیکن فیصلوں کا دارومدار "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" اور "کہ از مغز دو صد خرفکرِ انسانے نمی آید!" کے مصداق دو ووٹوں کی گنتی پر نہیں بلکہ 'صاحبِ امر' کی صوابدید پر ہوتا ہے! بنا بریں مختلف المزاج، مختلف المسلک، مختلف المشرب اور مختلف الرائے لوگوں کے جمع ہونے میں قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے! ——— اس لئے کہ یہاں تنظیم میں شمولیت کا فیصلہ صرف اس ایک امر پر مبنی ہوتا ہے کہ آیا کسی کو ایک شخص معیّن کے افکار و نظریات سے بحیثیت مجموعی اتفاق اور اُس کے خلوص و اخلاص پر فی الجملہ اعتماد ہے یا نہیں! اگر ہے تو اس سے بیعتِ جہاد و سمع و طاعت فی المعروف کے رشتے میں منسلک ہو جائے۔ پھر "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا" کے مطابق کھلے کانوں اور کھلی آنکھوں کے ساتھ اور عقل و فہم کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اُس کا ساتھ دے۔ کوئی غلطی نظر آئے تو تنقید کرے، غلط رجحانات نظر آئیں تو پیشگی متنبہ کرے، کسی معاملے میں رائے کا اختلاف ہو تو برملا اظہار کرے اور اس میں کسی کی شخصی عقیدت، یا اُس کے ذاتی رُعب یا ملامت کے خوف کو آڑے نہ آنے دے لیکن جب تک وہ "بحیثیت مجموعی اتفاق" اور "فی الجملہ اعتماد" کی کیفیت برقرار رہے 'اطاعت فی المعروف' کے دائرے سے باہر نہ نکلے ——— البتہ جب اُن دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی برقرار نہ رہے تو بیعت فسخ کرنے کا اعلان کرے اور علیحدگی اختیار کر لے——!! اور "هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ" کی قسم کے قضیے کھڑے کر کے نہ اپنا وقت ضائع کرے نہ دوسروں کا!

اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ اُس حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و السلام کے الفاظِ مبارکہ کی عظمتِ مجامعیت، ہیبت و جلالت اور محکمیت و مشیدیت کا جو انکشاف راقم الحروف کے شعور و ادراک پر ہوا ہے اور جو نقش اُس کے قلب پر قائم ہوا ہے اسکے بیان سے وہ ازبس قاصر ہے اس لئے کہ اس ایک مختصر حدیث میں 'اسلامی انقلابی پارٹی' یا "حزب اللہ" کا پورا

دستور موجود ہے یہ حدیث بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت عبادہ ابن صامتؓ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے جس میں انہوں نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے الفاظ نقل فرمائے ہیں (حدیث میں الفاظ کی نسبت حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی جانب ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تلقین خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمائے ہونگے!)

"بایعنا رسول اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسرِ والیسرِ وَالمنشطِ والمکرہ وعلیٰ اثرۃٍ علینا وَعلیٰ ان لا ننازع الامرَ اھلہٗ وعلیٰ ان نقول بالحق اینما کُنّا لانخاف فی اللہ لومۃ لائمٍ"

(ترجمہ) "ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کہ آپؐ کا ہر حکم سُنیں گے اور اسکی اطاعت کریں گے خواہ ہم پر تنگی ہو خواہ آسانی - اور خواہ ہمارے دل آمادہ ہوں خواہ اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے اور خواہ دوسروں کو (مناصب اور ذمہ داریوں وغیرہ کی تفویض میں) ہم پر ترجیح دی جائے اور یہ کہ ہم امراء سے نظم کے معاملے میں رسّہ کشی نہیں کریں گے — البتہ ہم حق بات ضرور کہیں گے خواہ کہیں بھی موقع پیش آئے اور اللہ (اور اس کے دین) کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کریں گے :

اس وقت ظاہر ہے کہ راقم کو نہ 'بیعت' کے مسئلے پر مفصل گفتگو کرنی ہے نہ خود اس حدیث کی تفصیلی تشریح بلکہ یہ بات صرف برسبیل تذکرہ قلم پر آگئی کہ یہی وہ واحد نظام ہے جس میں "دو ہر گلے ما رنگ و بوئے دیگر است!" کے کیفیت کے حامل لوگ جمع ہو سکتے ہیں اور راقم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اُس تعالیٰ نے اُس کی اس جانب رہنمائی فرمائی اور ایک سُنّت کو زندہ کرنے کی سعادت بخشی — اور وہ اپنے اس صدمہ اور رنج و غم کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہاں ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا حال یہ ہے کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر \
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے \
نئی تہذیب کی بے رُوح بہاروں کے عوض \
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

— وہاں 'حامیانِ دین' اور 'خادمانِ شرعِ متین' کی بھی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اپنی تنظیموں اور جماعتوں کو اس 'بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف' کی اساس پر استوار کرنے کی بجائے مغرب سے درآمد شدہ طریقوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں چنانچہ تشتت و انتشار اور تقسیم در تقسیم کا جو عمل عام غیر مذہبی سیاسی جماعتوں میں نظر آتا ہے بعینہٖ وہی ان کے یہاں بھی موجود ہے - فاعتبروا یا اولی الابصار!! -

اِس اصولی وضاحت کے ساتھ، ـــــ اور سرِ دست بہت سے معاملات پر تفصیلی گفتگو سے معذرت کے ساتھ ـــــ راقم چند ضمنی وضاحتیں پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہے:

(۱) گذشتہ سال کے محاضراتِ قرآنی کے ضمن میں محترم مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے بارے میں میرے بعض الفاظ سے بھی محض میرے عجزِ بیان کی بنا پر مولانا کو سوءِ ظن لاحق ہو گیا تھا اور علوی صاحب کے قلم نے تو واقعتہً ان کے تذکرے میں رواروی میں کچھ نامناسب انداز اختیار کر لیا تھا۔ جس پر مولانا کا ایک بہت تُند و تلخ خط موصول ہُوا تھا۔ اس کے جواب میں مَیں نے اپنے الفاظ کی بھی تاویل پیش کی اور مولانا کے انکے اندازِ تحریر کی جانب بھی توجہ دلائی تو الحمدللہ کہ انہوں نے میری تاویل کو بھی قبول فرمایا اور اپنی غلطی کو بھی تسلیم کر لیا۔ البتہ علوی صاحب کے بارے میں اپنا احتجاج برقرار رکھا جس کے ضمن میں ایک ملاقات میں مَیں نے ان سے علوی صاحب کی جانب سے معذرت کر لی تھی لیکن چونکہ اس کے بعد قلم میرے ہاتھ میں آیا ہی نہیں لہٰذا "علیٰ رؤوس الاشہاد" اعتراف و اعتذار کی نوبت نہ آسکی۔ آج پہلی بار تذکرہ و تبصرہ رقم کر رہا ہوں تو یہ قرض مزید معذرت کے سُود کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔

اِس اثناء میں علوی صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے ناقدین پر برہمی کے اظہار کے ضمن میں بعض دوسری شخصیات کے ساتھ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم و مغفور کو بھی لپیٹ میں لے لیا اور اُن کے ضمن میں بھی اُن کے اندازِ تحریر میں وہی رنگ آگیا ـــــ ادھر شیخ جمیل الرحمٰن کے قلم سے بعض مذہبی جرائد کے راقم الحروف اور تنظیمِ اسلامی کے ساتھ معاندانہ رویے پر کچھ دردمندانہ الفاظ نکل گئے ـــــ اُن کو بنیاد بنا کر مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے پھر ایک "عتاب نامہ" شیخ صاحب کے نام لکھا ہے جو پہلے خط کے مقابلے میں تو اگرچہ بہت نرم ہے تاہم یہ بھی اُن کی عمر اور علمی مرتبے کے شایانِ شان نہیں ہے اور اگرچہ انہوں نے نہایت متحیرانہ انداز میں اس کی اشاعت کا مطالبہ کیا ہے تاہم راقم الحروف اس معاملے میں بھی فی الحال علی الاعلان معذرت پر اکتفا کرنے ہی کو مناسب سمجھتا ہے، اِس وضاحت کے ساتھ کہ: (۱) اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم حضرت شیخ الہندؒ کے نہایت قریبی اور حد درجہ معتمد علیہ ساتھی تھے تاہم ان کے آخری دَور کے نظریات کے ضمن میں متضاد روایات کی بنا پر مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ نہایت لطیف انداز میں بعض باتیں مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بھی منقول ہیں اور مجھ تک ایک خالص ذاتی اور نہایت قریبی روایت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی بھی پہنچی ہے لیکن خود راقم تاحال اس ضمن میں نہ کوئی حتمی رائے قائم کر سکا ہے اور نہ ہی اس نے

اِس کی کوئی شدید ضرورت محسوس کی ہے، اِس لیے کہ اب مولانا سندھی "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ" کے زُمرے میں شامل ہو چکے ہیں، ہمیں اب اصل فکر "اپنی" اور "حال" کی کرنی چاہیئے۔ تاہم اِس ضمن میں علمی تحقیق اور سنجیدہ گفتگو میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے! ——— (ii) مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی زیارت ان گناہگار آنکھوں نے بھی کی ہے۔ اور راقم اپنے امکانی علم کی حد تک نہ صرف اُن کے پیکرِ خلوص و اخلاص اور مجسمۂ تقوی و للّٰہیت ہونے کی گواہی دیتا ہے بلکہ اُن کے حد درجہ معتدل مزاج ہونے کا بھی دل سے معترف ہے۔ خصوصاً ان کا یہ طرزِ عمل کہ مولانا مودودی مرحوم سے بعض معاملات میں شدید اختلاف کے باوصف اقامتِ دین کی جدّوجہد میں آخر دم تک اُن کے رفیق کار رہے اور اپنی شدید ترین علالت کے باوجود انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا ایک ایک قطرہ خدمتِ دین کے لیے نچوڑ دیا! ہم ایسے لوگوں کے لیے بہت ہی رشک آور، جذبہ پرور اور ولولہ انگیز ہے! ——— واضح رہے کہ مولانا 'وہابی' مزاج کے انسان تھے اور اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ مولانا مودودی مرحوم سے کسی اندھی عقیدت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہوں، ——— بلکہ مولانا پر اُن کی بعض ذاتی نوعیت کی شدید تنقیدیں بھی راقم کے علم میں ہیں، اِس کے باوجود اگر وہ آخری سانس تک جماعتِ اسلامی میں رہے تو یہ صرف اور صرف "احساسِ فرض" کی اساس پر تھا! (ویسے یہ واضح رہے کہ اُن کا انتقال ۵۷-۱۹۵۶ء کے ہنگامۂ اختلاف سے قبل ہو گیا تھا ورنہ اُس مرحلے پر وہ بھی لازماً جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہوتے، واللّٰہ اعلم!)

بہرحال اِن گذارشات کے ساتھ مولانا عبدالغفار حسن صاحب کی خدمت میں راقم کی درخواست یہ ہے کہ وہ اپنے خط کی اشاعت پر اصرار نہ فرمائیں ورنہ اُس کی اشاعت کے بعد اُس کا لفظ بلفظ جواب بھی لازمی ہو جائے گا اور چونکہ اس معاملے میں اصل فریق مولانا علوی ہیں لہٰذا جواب کا حق بھی اُن ہی کو حاصل ہوگا ——— اور اس طرح خواہ مخواہ ایک لمبی بحث چھڑ جائے گی!

(۲) اِسی طرح خدمتِ دین کے میدان کے نمایاں رجالِ کار اور اصحابِ دعوت و عزیمت کی جو فہرست علوی صاحب نے مرتب فرمائی ہے (جس کا ایک تکملہ بھی اُن کے مضمون کی آخری قسط کے ساتھ اس پرچے میں شائع ہو رہا ہے) اُس میں مولانا مودودی مرحوم کے نام کے نمایاں طور پر غائب ہونے پر بھی خاصی چہ میگوئی بلکہ لے دے ہوئی ہے۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کے ایک رفیق عبدالوہاب صاحب نے تو ایک نہایت مفصل اور خلوص و اخلاص سے مملو خط میرے نام لکھا۔ وہ مَیں نے علوی صاحب کو پڑھوایا تو

انہوں نے بھی ایک نہایت مفصل اور دو ٹوک خط جواباً تحریر فرما دیا۔ یہ دونوں خطوط دلچسپ ہیں ــ آج کل 'استحکامِ پاکستان' کی سلسلہ وار اشاعت کی بناء پر 'میثاق' کا دامن تنگ پڑ گیا ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ کبھی یہ دونوں خطوط قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کر دیئے جائیں گے۔

راقم کو اِس کا شدّت کے ساتھ احساس ہے کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے ساتھ اپنے تعلق اور اُن کے بارے میں اپنی آخری اور حتمی رائے کو جنچے تُلے الفاظ میں وضاحت کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لے آنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے راقم نے چند سال قبل "مولانا مودودی اور مَیں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھنا شروع بھی کیا تھا لیکن اُس کی صرف ابتدائی اقساط ہی سپردِ قلم ہو سکیں تھی۔ بہر حال "کُلُّ اَمْرٍ مُسْتَقِرٌّ" کے مطابق مناسب تفصیل کے ساتھ تو یہ کام اپنے وقتِ متعین پر ہی ہوگا۔ سرِدست صرف اِس قدر عرض ہے کہ مولانا مودودی سے شدید ترین نوعیت کے اختلافات کے باوجود، جن کا تعلق علمی اور نظریاتی سطح سے بھی ہے اور عمل اور پالیسی کی سطح سے بھی، راقم الحروف کے نزدیک چودہویں صدی ہجری کے 'داعیانِ اسلام' اور 'خادمانِ کتابِ مبین و دینِ متین' کی فہرست میں اُن کا نام بھی نمایاں مرتبہ و مقام کا حامل ہے! ــ اور خود راقم الحروف تو اُن کا حد درجہ ممنونِ احسان ہے کہ جہاں اُسے بچپن ہی میں 'جذبۂ ملّی' سے سرشار کرنے والے اصلاً علّامہ اقبال مرحوم اور ثانوی درجے میں حفیظ جالندھری مرحوم تھے وہاں عنفوانِ شباب میں دین اور خدمتِ دین کی جانب عملاً کھینچنے والے ہیں مولانا مودودی مرحوم و مغفور! اگر مَیں اُن کی تحریروں کے ذریعے اسلام کے حرکی تصوّر سے 'مفتوح' (!) نہ ہو جاتا تو نہ مولانا اصلاحی صاحب سے واقف ہو سکتا نہ مولانا فراہی سے، اور نہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ کے حواشی پڑھنے کی نوبت آتی نہ حضرت شیخ الہند رحؒ سے تعارف حاصل ہوتا! لہٰذا مولانا مودودی کے بعض علمی نظریات (بالخصوص 'خلافت و ملوکیت' نامی تصنیف) اور اُن کے بعض عملی اقدامات پر گہرے حسرت بھرے تأسف کے باوصف میرے دل میں ذاتی طور پر مولانا مودودی کا بھی اتنا ہی ادب و احترام ہے جتنا اپنے والدِ مرحوم کا! اللہ تعالیٰ اُن دونوں کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے! آمین۔

جب معذرتوں کا دفتر کھُل ہی گیا ہے تو ایک قرض اور ہے، لگے ہاتھوں اس سے بھی سبکدوشی ہو جائے تو اچھا ہے ــ

راقم نے کسی موقع پر علماءِ کرام کے بارے میں اپنے رویّے کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت

مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا تھا کہ سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ لاہور تشریف لائے، اُس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ انہوں نے خاص میری ملاقات کے لیے ہی یہ پورا شدِّ رحال فرمایا تھا۔ اور فی الواقع اُس وقت اسی انداز سے یہ بات میرے علم میں آئی تھی۔ بعد میں سردار صاحب نے اپنے ایک خط میں ایک تو اس کی تصحیح فرمائی تھی کہ اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے کسی پروگرام سے اسلام آباد جانے والے تھے، میرے کہنے پر انہوں نے لاہور میں مختصر قیام اسی مقصد سے کر لیا تھا۔ دوسرے کوئی معاملہ اُس وقت کی گفتگو کے بارے میں بھی تھا۔ اس پر میں نے انہیں تحریر کیا تھا کہ آپ پوری بات تحریر فرما کر ارسال فرما دیں۔ میں 'میثاق' میں شائع کر دوں گا — لیکن جب ۶ / اور ۷ / نومبر ۱۹۸۵ء کی درمیانی شب میں نے اُن کے یہاں گذاری تو انہوں نے فرمایا کہ تم خود ہی وضاحت کر دو اب جیسے کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اس کے بعد میرے ہاتھ میں قلم اب ہی آیا ہے۔ لہٰذا تاخیر کی مزید معذرت کے ساتھ مقصدِ سفر کے ضمن میں وضاحت تو حاضر ہے۔ رہی گفتگو کی تفصیل تو وہ میری یادداشت میں محفوظ نہیں رہی۔ سردار صاحب یا حضرت مفتی صاحب اگر ضروری خیال فرمائیں تو اُن سے درخواست ہے کہ خود تحریر فرما دیں، 'میثاق' میں ان شاء اللہ اُن کی تحریر من و عن شائع ہو جائے گی!

جمعہ ۳ / جنوری ۱۹۸۶ء کو راقم الحروف بفضلہٖ تعالیٰ اپنی سب سے چھوٹی بچی کے عقدِ نکاح کی ذمہ داری سے باحسنِ وجوہ سبکدوش ہو گیا۔ اس کی جو رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی وہ ۴ / جنوری کے روزنامہ 'امروز' لاہور کے حوالے سے ہدیۂ قارئین ہے:

"ڈاکٹر اسرار احمد کی صاحبزادی کی شادی
بچّی کو بغیر جہیز مسجد ہی سے رخصت کر دیا گیا

لاہور ۳ / جنوری۔ معروف دینی مفکّر، بانی صدر انجمن خدّام القرآن اور امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے آج جامع مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں نمازِ جمعہ کے فوراً بعد اپنی پانچویں اور سب سے چھوٹی بیٹی آنسہ امۃ الہادی کا نکاح اشفاق احمد کے ساتھ پڑھایا۔ اور مسجد ہی سے بچشمِ تر رخصت کر دیا۔ بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب —

—— بچی کو "ایک دھیلے کا جہیز" نہیں دیا گیا لیکن امت الہادی اپنے والدین، تایا، چچا، ماموں، بڑی بہنوں، بڑے اور چھوٹے بھائیوں اور ڈاکٹر صاحب کے ہزاروں معتقدوں اور مقتدیوں کی دعاؤں اور مستقبل کے لیے نیک تمناؤں کا انمول تحفہ لے کر سسرال سدھار گئیں۔ یہ شادی اس اعتبار سے منفرد تھی کہ نہ ڈاکٹر اسرار احمد کی رہائش گاہ پر شادی بیاہ کی کوئی گہما گہمی نظر آئی، نہ لڑکی دلہن بننے کے لیے بیوٹی پارلر گئی۔ نہ شہنائی بجی نہ ڈھول ڈھمکے اور نہ باجے گانے کے ساتھ بارات کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ دولہا، ان کے والد، اعزاء و اقرباء اور ان کے دوست اور احباب خطبۂ جمعہ سے قبل دوسرے نمازیوں کی طرح مسجد میں داخل ہوئے اور جیسے جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے۔ حسبِ اعلان ڈاکٹر صاحب نے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے سورۃ الحجرات کا درس شروع کیا اور ساڑھے بارہ بجے جمعہ کی پہلی اذان ہوئی۔ جس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا۔ اس تبصرہ کے اختتام سے قبل ڈاکٹر اسرار احمد نے سامعین کو گذشتہ جمعہ کا اعلان یاد دلایا اور کہا کہ آج نمازِ جمعہ کے بعد میری پانچویں اور سب سے چھوٹی بچی کا نکاح ہوگا آپ حضرات اس میں شرکت فرمائیں"

الحمدللہ کہ میرے داماد اشفاق احمد، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تو تھے ہی اب قرآن اکیڈمی کے دوسالہ کورس میں بھی شریک ہیں، —— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نہایت پختہ دینی مزاج رکھتے ہیں۔ جملہ رفقاء و احباب اور قارئینِ 'میثاق' سے استدعا ہے کہ اُن کے اور میری بچی کے لیے "فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً" کی دعا فرمائیں!

اِس عقدِ نکاح کے موقع پر خطبۂ نکاح کے ضمن میں راقم نے جہاں معمول کے مطابق شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں اصلاح کی اہمیت پر گفتگو کی وہاں پورے مجمع کو گواہ بنا کر اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کا اعتراف و اعلان اور اس پر اپنے شکر و امتنان کا اظہار کیا کہ میں نے آج سے لگ بھگ بارہ برس قبل ارضِ لاہور میں جس اصلاحی تحریک کا آغاز کیا تھا اُس کا جو اُخروی اجر و ثواب اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا (اِن شاء اللہ) وہ تو اصل مطلوب و مقصود ہے ہی اُس کے علاوہ اِس دنیا میں بھی مجھے اُس کی نقد اُجرت، اِس طرح مل گئی ہے کہ اپنی پانچ بچیوں کی شادی سے میں جس سہولت اور آرام کے ساتھ فارغ ہوا ہوں اُس کا بحالات موجودہ

کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا! اِس سہولت کے لیے میرے ذہن میں بے اختیار جو مثال آئی ہے وہ وہ ہے جو ایک حدیثِ نبویؐ میں بندۂ مومن کی رُوح کے جسدِ مادّی سے علیحدگی کے لیے وارد ہوئی ہے یعنی ایسے جیسے کسی مشکیزے کے بند منہ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک جائے، اللہ تعالیٰ کے اس انعام و احسان کے اعتراف اور اس پر شکر و امتنان پر مَیں جملہ قارئینِ 'میثاق' کو بھی گواہ بناتا ہوں!! وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا !!

اِس ضمن میں راقم کا ارادہ ہے کہ ایک مفصل مضمون تحریر کرے جس سے ایک جانب " وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ " کا حق پورے طور پر ادا ہو سکے — اور دوسری طرف دوسروں کا بھی حوصلہ بڑھے اور " فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى " اور " فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ " کے عملی مظاہر کے ذکر سے ایمان و یقین اور اللہ تعالیٰ پر توکّل و اعتماد میں اضافہ ہو! — لیکن یہ ارادہ کب پورا ہو سکے گا یہ صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

اِس 'اصلاحی تحریک' کے ضمن میں محترم مفتی جمیل احمد تھانوی نے جو مخالفانہ مہم شروع کی ہوئی ہے اِس پر کسی صاحب کا ایک مضمون "حساس" کے قلمی نام سے ہفت روزہ 'حرمت'، راولپنڈی میں شائع ہُوا تھا جو 'میثاق' میں بھی نقل کر دیا گیا۔ اِس میں صاحبِ مضمون کے قلم سے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شان میں ایک نامناسب جملہ نکل گیا تھا اس پر ایک مفصل مضمون مولانا شمس الحسن تھانوی خطیب جامع مسجد خضراء کراچی کا موصول ہُوا۔ مولانا موصوف ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں اور غالباً 'میثاق' التزاماً دیکھتے ہیں اِس لیے کہ اِس سے قبل بھی ہمیں اُن کی جانب سے متعدد مواقع پر مفید مشورے ملتے رہے ہیں۔ اِس بار راقم کو افسوس ہُوا کہ مولانا نے مضمون کے ساتھ جو رقعہ ارسال فرمایا اُس میں درج تھا کہ اگر یہ مضمون 'میثاق' میں شائع نہ ہو سکتا ہو تو واپس کر دیا جائے جس کے لیے ایک لفافہ جس پر ڈاک کے ٹکٹ چسپاں تھے مضمون کے ساتھ ملفوف تھا۔ اِس میں راقم کو کسی قدر خفگی اور سُوءِ ظن کی جھلک نظر آئی، بہرحال راقم نے اُسی وقت طے کر لیا تھا کہ کراچی تو آنا جانا ہوتا ہی رہتا ہے مولانا کی خدمت میں خود حاضر ہو کر نیاز بھی حاصل کروں گا — اور وہ لفافہ بھی خود واپس کروں گا — اللہ کا شکر ہے کہ اس کا موقع گذشتہ سفرِ کراچی کے موقع پر مل گیا۔ راقم نے مولانا سے 'شکوہ' بھی کیا، اُن کا مرسلہ لفافہ بھی واپس کیا، مضمون کی اشاعت کا وعدہ بھی کیا — اور ایک بات مزید یہ عرض کی کہ "حضرت! آپ نے مولانا تھانوی رحؒ کی سیرت و شخصیت پر نہایت شاندار تحریر بھی عطا فرمادی، اور معترض کے جواب کا حق بھی ادا فرمادیا — لیکن اصل مسئلہ یعنی شادی بیاہ کی تقریبات کی اصلاح

کے ضمن میں میری کوشش اور اس کے ضمن میں مفتی جمیل احمد صاحب کی جرح و تنقید کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں فرمائی، حالانکہ یہ تو دراصل آپ حضرات ہی کے گھر کی چیز ہے، اِس لیے کہ ــــ 'اصلاح الرسوم' تو حضرت تھانوی رح کا خاص موضوع تھا!" اِس پر مولانا نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد ایک نہایت جامع اور معنی خیز جملہ ارشاد فرمایا جو مَیں فی الحال نقل نہیں کر رہا اور وعدہ فرمایا کہ اچھا! مَیں اس موضوع پر لکھوں گا!"ــــ

مولانا کا متذکرہ مضمون ــــ میرے لیے بہت حیرت ناک ہے اِس لیے کہ اس میں جس قدر صاف اور ستھری زبان اور انشاء کا نہایت منجھا ہُوا اسلوب استعمال ہُوا ہے وہ اکثر لوگوں کو طویل مشق کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا جبکہ مولانا کے بارے میں راقم کے علم میں بالکل نہیں ہے کہ اُن کا تحریر سے زیادہ شغف یا شغل ہے! اِس کے علاوہ حضرت مولانا تھانوی رح کا جو کامیاب دفاع مولانا نے فرمایا ہے وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مَیں نے مولانا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مضمون فروری کے 'میثاق' میں شائع ہو جائے گا۔ اور اس کے لیے اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی لیکن عین وقت پر 'تنگیٔ داماں' کی بنا پر اُسے روکنا پڑا۔ اِس پر راقم مولانا سے 'معذرت خواہ' ہے، ان شاء اللہ آئندہ ماہ یہ ضرور شائع ہو جائے گا' ــــ اللہ سے دعا اور مولانا سے استدعا ہے کہ اِس دوران میں وہ موعودہ تحریر بھی عطا فرما دیں تو دونوں چیزیں بیک وقت ہدیۂ قارئین کر دی جائیں ــــ (راقم مولانا کا وہ فصیح و بلیغ جملہ اِس لیے نقل نہیں کر رہا کہ قارئینِ 'میثاق' کا اشتیاق تفصیلی تحریر کے لیے برقرار رہے۔!!)

" لَا یَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا " ــــ کا حوالہ اِس صدی میں سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۱۹۱۲ء میں 'الہلال' میں امام مالک رح کے قول کی حیثیت سے دیا تھا۔ مولانا مرحوم کو اس مقولے سے کس درجہ محبت و انسیت تھی، اس کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تقریباً ۱۰ سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں لاہور میں منعقدہ جمعیت العلماء ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس میں اپنے تحریری خطبۂ صدارت میں پھر اس کا حوالہ دیا (جمعیت العلماء ہند، مرتبہ پروین روزینہ صاحبہ جلد اوّل، صفحہ ۱۰۲) اور اس بار پھر اُسے امام مالک رح ہی کے قول کی حیثیت سے نقل کیا ــــ راقم نے بحمد اللہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے گذشتہ بیس سال کے دوران اسے بہت عام کیا ہے ــــ اسی دوران میں ایک بار پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور نے فرمایا تھا کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق کا قول ہے چنانچہ

میں نے بعض مواقع پر اس کی یہ نسبت بھی بیان کی، لیکن چونکہ نہ چشتی صاحب ہی اس کا حوالہ دے سکے نہ میں خود تلاش کر پایا لہٰذا میں نے دوبارہ اسے امام مالکؒ ہی کی جانب منسوب کرنا شروع کر دیا ___ راقم بے حد ممنون و مشکور ہے ادارۂ فیوضاتِ محمدیہ، شیر گڑھ، تحصیل و ضلع مانسہرہ کے جناب شمس مجددی کا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی تحقیق کا حق ادا کر دیا ___ بلکہ اس کے جزوِ ثانی کی صورت میں علم و حکمت کا ایک اور گراں بہا موتی ہمیں عنایت فرما دیا۔ فَجَزَاہُ اللہُ عنا خیر الجزاء ___ ہم اُن کے شکریئے کے ساتھ اُن کا خط ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں:

اِس ضمن میں محترم مکتوب نگار نے جس اہم امر کی جانب راقم کی توجہ منعطف کرائی ہے، اِس پر اُن کے خصوصی شکریئے کے ساتھ عرض ہے کہ بحمد اللہ نہ یہ امر راقم پر مخفی ہے نہ یہ حقیقت کہ خود راقم میں یہ صلاحیتیں مطلوبہ معیار کے کسی ہزارویں درجے میں بھی موجود نہیں ہیں، البتہ اِس سلسلے میں ایک تیسری حقیقت بھی ہے جو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے اور وہ یہ کہ لاریب یہ کام بالفعل تو اُسی شخص کے ذریعے ہو گا جس کی نشاندہی جنابِ صدیقِ اکبرؓ نے کی ہے لیکن اِس کے لیے امکانی کوشش ہر صاحبِ ایمان کا فرض ہے۔ بالکل ایسے جیسے کسی فردِ واحد کی زندگی میں دعوت و تنظیم، تربیت و تزکیہ اور جہاد و قتال کے جملہ مراحل کا اِس حد تک طے پا جانا کہ اللہ کی زمین کے کسی قطعہ پر اُس تم کا دین بالفعل غالب و قائم ہو جائے، تاریخ میں صرف ایک ہی بار ہُوا ہے یعنی سیّد الاوّلین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم وفداہ آباءُنا و اُمّہاتُنا کے دستِ مبارک سے، تاہم اِس کے لیے کوشش اور جدّ و جہد جملہ انبیاء و رُسل نے کی ___ لہٰذا اگر آج کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی یہ زعم ہو جائے کہ یہ مہم اُس کے ذریعے لازماً سَر ہو جائے گی تو یہ بہت بڑا دعویٰ اور سراسر مغالطہ ہو گا رہا خود اِن سطور کا عاجز و ناچیز راقم یا اُس جیسے اور لوگ، تو اگر ہم اِس 'خبط' میں مبتلا ہو جائیں تو اسے خللِ دماغی کے اور کسی چیز سے موسوم نہیں کیا جا سکتا! ہماری تو بڑی سے بڑی آرزو یہ ہو سکتی ہے کہ ع "کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا" کے مصداق ہمارا شمار اِن لاکھوں کروڑوں ستاروں میں ہو جائے جو خورشید کے طلوع ہونے سے قبل اپنی ہستی کو فنا کر لیتے ہیں! ___ گویا ہم حضرت یحییٰ علیہ السلام کے الفاظ کے مطابق آنے والے "افضلکم مقدرۃً واملکھم لنفسہ" کے لیے "راستہ صاف کرنے والے" بن جائیں تو یہی عین سعادت ہو گی! رزقنا اللہ ذالک!!

افکار و آراء

ایک نہایت اہم خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ فیوضاتِ مجددیہ

خانقاہ فضلیہ شیرگڑھ، تحصیل و ضلع مانسہرہ

محترم جناب ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدت سے خیال تھا کہ جناب کی توجہ عربی عبارت کے ایک مقولہ "لایصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا" کی طرف مبذول کراؤں، جسے آپ امام مالکؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ آپ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ آپ بغیر کسی دلیل کے ایسی بات کہہ دیں۔ مگر میرا خلجان اس وجہ سے بھی تھا کہ مرشدی حضرت قاضی محمد حمید فضلی دام برکاتہم نے اسی جملہ کو بعینہٖ حضورؐ کی حدیث کے طور پر اپنے کسی مضمون میں تحریر کیا تھا۔ چنانچہ اپنے کتب خانہ میں دستیاب کتابوں میں یہ جملہ حدیث تو نہ ثابت ہوسکا اور نہ ہی ان میں حضرت امام مالکؒ کا مقولہ ـــــ البتہ حضرت امام شعرانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف "طبقات کبریٰ" ص۱۵۱، ج ۱ پر حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ترجمہ (سوانحی تذکرہ) میں ان کی طرف یہ الفاظ منسوب ہیں۔

ان ھذا الامر لا یصلح بہ آخرہ الا بما صلح بہ اولہ ولا یحتملہ الا افضلکم مقدرۃ واملکھم لنفسہ:

بالفرض اگر امام مالکؒ کی طرف کسی کتاب میں منسوب آپ کی نظر سے گذرا ہو تو شاید یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کے اتباع و روشنی میں ان کا قول ہوگا۔ جس کی ابتدائی اور بنیادی نسبت حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہونی چاہیئے۔ اس مقولہ کے آخری دو جملے بھی آپ کے غور و فکر کے لئے پیش ہیں۔ تاکہ اصلاحِ امت میں حضرتؓ کی فرمودہ اہلیت ـــ احتمال اصلاح یعنی اصلاح امت کا بیڑہ بھی وہی اٹھا سکتا ہے ـــــ جو طاقت و مقدرت کے لحاظ سے افضل ہو ـــــ دنیاوی اعتبار سے ـــــ اور روحی و قلبی اعتبار سے املکھم لنفسہ ـــــ یعنی ضبطِ نفس کا حامل ہو اور ساتھ ساتھ اس کی خباثتوں پر بھی کنٹرول کر سکنے کی ہمت رکھتا ہو۔ امید کہ جناب ایک دور افتادہ پسماندہ علاقہ کے ایک بھائی کی سچی بات کو قبول کرنے میں بخل نہ برتیں گے والسلام: شمس مجددی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

حدیث نبوی ”بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء“ کے مصداق کامل

حاجی عبدالواحدؒ کا انتقال

یہ دنیا دارِ فانی ہے اور یہاں جو بھی آیا ہے اُسے جلد یا بدیر یہاں سے جانا ہی ہے، فرق صرف پہلے اور بعد اور آگے اور پیچھے کا ہے۔ چنانچہ زیارتِ قبور کے سلسلے میں ماثورہ الفاظ یہ ہیں :۔ ” اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ! یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ “ —— یعنی ” اے قبروں والو تم پر سلامتی ہو، اللہ ہماری بھی مغفرت فرمائے اور تمہاری بھی، تم ہم سے پہلے گذر گئے ہو لیکن ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے آ ہی رہے ہیں !“ —— لیکن ظاہر ہے کہ جیسے یہاں آنے والے، سوائے رنگ و شکل کے ظاہری و معمولی فرق کے، سب ایک سے ہوتے ہیں جانے والے ایک سے نہیں ہوتے! چنانچہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جاتے ہی ’نَسْیًا مَّنْسِیًّا‘ ہو جاتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے طویل اور تا دیر باقی رہنے والی یادیں چھوڑ جاتے ہیں !

ایسی ہی ایک شخصیت ہفتہ ۱۱ جنوری ۸۶ء کو دن کے لگ بھگ گیارہ بجے نہایت خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو گئی —— ہماری مراد حاجی عبدالواحد صاحب سے ہے جو شمسی حساب سے پچاسی برس اور ۲۸ دن اِس دارِ فانی میں گذار کر متذکرہ بالا تاریخ کو راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ! اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَاَدْخِلْہُ فِیْ رَحْمَتِکَ وَحَاسِبْہُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۔ آمین یا ربّ العٰلمین

حاجی صاحب چونکہ گذشتہ بیس برس سے بھی زائد عرصہ سے علیل تھے اور ان کی پبلک لائف اب سے تقریباً ربع صدی قبل ختم ہو چکی تھی لہٰذا پاکستان کی نئی نسل تو اِن سے واقف ہی نہیں ہے۔ تاہم چونکہ ۱۹۷۰ء سے ۸۱-۱۹۸۰ء تک اُن کا راقم الحروف کے ساتھ بڑا گہرا ربط رہا۔ لہٰذا ’تنظیم اسلامی‘ کے سینئر لوگ اُن سے خوب واقف ہیں البتہ گذشتہ پانچ سال سے چونکہ وہ بالکل

صاحبِ فراش ہو چکے تھے، لہٰذا تنظیم کے بھی اکثر نئے رفقا کو اُن سے واقفیت نہیں ہے۔

راقم الحروف کو اُن کی نمازِ جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی تو اُس موقع پر جو چند جُملے اُس نے کہے، اُن میں یہ بھی تھا کہ "انسان کا باطن تو اللہ ہی کے حوالے ہے، جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے کم ازکم مَیں نے اپنی زندگی میں حاجی صاحب جیسا پابندِ شریعت، انسان کوئی اور نہیں دیکھا!" چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ مکمل شرعی پردہ، بھی راقم نے زندگی میں پہلی بار حاجی صاحب مرحوم کے یہاں دیکھا! — اور وعدہ کی پابندی بھی جتنی راقم نے اُن میں دیکھی اور کہیں نہیں دیکھی!

حاجی صاحب کی زندگی کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اِس صدی کی کوئی قابلِ ذکر دینی و مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں حاجی صاحب نے حصّہ نہ لیا ہو۔ اگرچہ اکثر و بیشتر تحریکوں اور جماعتوں کے ساتھ معاملہ یہ ہُوا کہ یا وہ حاجی صاحب کی صاف گوئی کو برداشت نہ کر سکیں یا حاجی صاحب کی سیماب وش طبیعت اُن سے تادیر مطمئن نہ رہ سکی اور "ع" کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے!" اور "ع" ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!" کے مصداق خود انہوں نے نئی منزلوں کی جانب رُخ کر لیا!!

حاجی صاحب کے مختصر سوانحِ حیات حسبِ ذیل ہیں: (واضح رہے کہ یہ جملہ واقعات ویسے تو خود مَیں نے بھی حاجی صاحب سے سُنے ہیں لیکن تاریخوں اور سنوں کے لیے مَیں نے اُن کے صاحبزادے حافظ قاسم رضوان کو تکلیف دی تھی۔ چنانچہ ان کی ذمّہ داری اُن ہی پر ہے)

- ولادت: ۴ر دسمبر ۱۹۰۱ء بمقام اجنالہ (ضلع امرتسر)
- ۱۹۱۷ء: گورنمنٹ ہائی سکول کوئٹہ سے (جہاں اُن کے والد مولوی محمد حسن صاحب ہیڈ ماسٹر تھے) میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ جہاں قریب ہی حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ درسِ قرآن دیا کرتے تھے، یہیں سے دین کی آگ دل میں بھڑکی!
- ۲۱-۱۹۲۰ء: اسلامیہ کالج لاہور کو چھوڑ کر جامعہ ملّیہ، علی گڑھ میں جا داخلہ لیا جس کا سنگِ بنیاد حضرت شیخ الہندؒ نے رکھا تھا! اسی دوران میں تحریکِ ہجرت سے متأثر ہو کر، ہجرت کے ارادے سے راولپنڈی پہنچ گئے لیکن ساتھیوں کے بروقت نہ پہنچ سکنے کے باعث آگے نہ جا سکے! — واپس علی گڑھ پہنچے ہی تھے کہ والد صاحب کے انتقال کی اطلاع آ گئی، لہٰذا تعلیم درمیان میں چھوڑ کر کوئٹہ واپس آ گئے اور گورنمنٹ ہائی سکول ہی میں ملازمت اختیار کر لی۔
- ۱۹۳۰ء: پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ بی اے پاس کیا۔ انگریزی میں یونیورسٹی

میں اوّل آئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

• ۱۹۳۱-۳۲ء : ملازمت سے رخصت حاصل کرکے، گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوکر انگریزی میں ایم اے کیا۔

• ۱۹۳۳-۳۴ء : مزید رخصت حاصل کرکے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم رہے۔ وہاں سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے عربی کی تحصیل کی ـــ مولانا علی میاں حاجی صاحب سے انگریزی پڑھتے رہے! اُسی زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے بھی تعلق قائم ہُوا جو تا زیست قائم رہا۔

• ۱۹۳۵ء : حضرت مولانا احمد علی لاہوری رح سے بیعتِ سلوک! (حاجی صاحب کو حضرت لاہوری رح سے خلافت بھی حاصل تھی!)

• ۱۹۳۶ء : پہلا حج بیت اللہ اور اس کے دوران مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم سے تعارف اور مراسم!

• ۱۹۳۷ء : شادیٔ خانہ آبادی۔

• ۱۹۳۸ء : مولانا لاہوری رح کی خدمت میں دورۂ تفسیر کی تکمیل،

• ۱۹۴۰-۴۱ء : حضرت لاہوری رح کے ارشاد پر خانقاہ رائے پور میں شاہ عبدالقادر رح کی خدمت میں حاضری اور استفادہ، اسی دوران میں حضرت مولانا محمد الیاس رح سے تعارف ہُوا اور اِن کے پاس بھی طویل قیام رہا! اِس کے بعد تبلیغی جماعت کے ساتھ کافی طویل سفر کیے اور تمام اکابر سے رابطہ رہا۔

• ۱۹۴۲ء : اپنی بقیہ زندگی کو دین کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی نیت سے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

• ۱۹۴۲-۴۳ء : جماعتِ اسلامی کے مرکز واقع دارالاسلام، پٹھانکوٹ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے پاس قیام، ـــ لیکن جلد ہی بددل ہوکر مولانا محمد منظور نعمانی کے ساتھ ہی کنارہ کشی!

• ۱۹۴۳-۴۷ء : اپنے آبائی قصبہ اجنالہ ہی میں قیام اور درسِ قرآن کی تحریک کا آغاز ـــ ابتداء میں حوصلہ افزائی، بعد میں مقامی علماء کی شدید مخالفت!

• ۱۹۴۷ء کے اوائل ہی میں لاہور منتقل ہوگئے اور بعض دوسرے دینی بھائیوں کے ساتھ مل کر گڑھی شاہو میں ہندوؤں سے کچھ جائیداد خرید کی!

• ۱۹۴۸ء : حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں چھ ماہ مسلسل قیام اور سلوک کی تکمیل !

• ۱۹۵۱-۵۲ء : تبلیغی جماعت کے ساتھ دوسرا حج - ایک سال ارضِ مقدس ہی میں قیام - اس دوران میں مولانا سعید احمد خاں اور مولانا عبیداللہ بلیاوی سے خصوصی تعلقات و روابط !

• ۱۹۵۲-۵۳ء : ایک مثالی اسلامی بستی کے قیام کے لیے **انجمن رضوان** کے نام سے ایک کوآپریٹو سوسائٹی کا قیام - اور اس کے لیے دیوانہ وار کام !

• ۱۹۵۵ء : ادارہ اصلاح و تبلیغ (آسٹریلیا بلڈنگ، میکلوڈ روڈ، لاہور) کے زیرِ اہتمام قرآن مجید کی ایک آسان اور عام فہم تفسیر بعنوان "درسِ قرآن" لکھنے کے لیے علماء کا ایک بورڈ قائم ہوا جس کے حاجی صاحب بھی رکن بنائے گئے ـــــ اور تفسیر کے کام کے اختتام تک بورڈ کے رکن رہے !

• ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کا زمانہ حاجی صاحب کی زندگی میں بہت سی ناکامیوں اور مایوسیوں کا دور تھا۔ اس عرصہ کے دوران ایک طرف تبلیغی جماعت کے بعض اہم اور ذمہ دار حضرات سے شدید اختلاف کی بناء پر حاجی صاحب کا رابطہ اُس 'حلقے' سے بالکل ٹوٹ گیا۔ دوسری طرف انجمن رضوان، جسے حاجی صاحب نے اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھایا تھا، اور جس کے صدر اور مؤسس سب کچھ حاجی صاحب تھے، اُس سے اُنہیں اِس طرح نکال باہر کیا گیا جیسے دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے ! ـــــ ان دو شدید ترین صدموں کے باعث حاجی صاحب کی صحت ایک دم جواب دے گئی !

• راقم الحروف سے حاجی صاحب کا ربط ۱۹۷۱ء میں قائم ہُوا۔ راقم کے چند دروس و خطابات ہی سے انہیں راقم سے بہت اُنس ہوگیا۔ اور ایک طویل عرصے تک حاجی صاحب اپنی علالت اور ضعیفی کے باوصف لاہور میں میری ہر تقریر اور درس میں شرکت فرماتے رہے ۔

• ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی تاسیس کا مرحلہ آیا تو میرے اِس خیال کی حاجی صاحب نے اپنے تلخ تجربے کی بنا پر شدّت کے ساتھ تائید کی کہ اِس کا ڈھانچہ مروجہ جمہوری روایات کے مطابق نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اِس میں صدر مؤسس کی تاحیات صدارت بھی طے ہونی چاہیئے۔ اور اِس پورے عرصے کے دوران اُسے مجلس منتظمہ میں ویٹو کا حق بھی حاصل ہونا چاہیئے ـــــ اِسی ضمن میں انہوں نے میرے منع کرنے کے باوجود مولانا امین احسن اصلاحی اور شیخ سلطان احمد صاحب سے بھی گفتگو کی، اگرچہ ان حضرات نے اُن کی بات پر توجہ نہ فرمائی !

• ۱۹۶۲-۶۳ء کے دوران کسی موقع پر حاجی صاحب نے زبردستی راقم کا ہاتھ کھینچ کر اپنے آپ کو راقم کے ساتھ 'بیعت جہاد' کے رشتے میں منسلک کر لیا۔ اس وقت تک خود راقم نے اس کے بارے میں سوچا تک نہ تھا (اگرچہ اصولی طور پر راقم کا یہ ذہن ۱۹۵۸ء میں بن چکا تھا کہ 'اقامتِ دین' کے لیے قائم ہونے والی جماعت کی اساس 'بیعتِ جہاد' ہی پر ہونی چاہیئے!)

• ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی تو حاجی صاحب اُس کے تاسیسی ارکان میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۶ء میں حاجی صاحب نے علالت اور پیرانہ سالی کے باوجود راقم اور تنظیم اسلامی کے دیگر ساتھ ستر رفقاء کی معیت میں کوئٹہ کا سفر کیا۔ اور قرآنی تربیت گاہ میں شرکت فرمائی!

• ۱۹۸۰ء تک راقم اور تنظیم اسلامی کے ساتھ حاجی صاحب کا تعلق نہایت پُرجوش اور فعّال طرز کا رہا۔ چنانچہ اسی دوران میں حاجی صاحب نے راقم کو اپنی جائداد میں سے دو کنال کے رقبے پر مشتمل ایک کوٹھی ہبہ کی جس کے ایک چوتھائی کے بارے میں اُن کے اور تبلیغی جماعت کے ایک معروف بزرگ حاجی عبدالحمید صاحب کے مابین تنازعہ بھی چل رہا تھا (جو تاحال جاری ہے) الحمدللہ اُسی کوٹھی کے تین چوتھائی پر وہ عمارت تعمیر ہو رہی ہے جس میں تنظیم اسلامی کا مرکزی دفتر منتقل ہو رہا ہے۔

• ۱۹۸۰ء کے بعد سے حاجی صاحب تقریباً صاحبِ فراش ہو گئے اور کہیں آنا جانا بالکل موقوف ہو گیا۔ اور اس عرصے کے دوران... اُن کے مزاج میں کچھ تلخی اور چڑچڑاپن بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان ہی ایام میں ایک مرتبہ جب مولانا علی میاں مدظلہٗ کا لاہور آنا ہوا اور وہ حاجی صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو حاجی صاحب اُن سے بھی نہایت درشتی کے ساتھ پیش آئے! اگرچہ مولانا نے اس کا قطعاً بُرا نہ منایا ـــــ اور راقم کی اُن سے جب بھی ملاقات ہوئی مولانا نے حاجی صاحب کی صحت و عافیت کے بارے میں ضرور دریافت فرمایا ـــــ اور سلام کہلوایا! چنانچہ میں نے بھی مولانا کو حاجی صاحب کے انتقال کی اطلاع بذریعہ تار دی اور اُن کا بھی دعائے مغفرت اور تعزیت کا پیغام بذریعہ تار ہی ملا! اِدھر میری مصروفیات بھی ایک دم بہت بڑھ گئیں اور حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری کے مواقع کم ہو گئے ـــــ چنانچہ ع "عشق است و ہزار بدگمانی!" کے مصداق حاجی صاحب کو راقم سے بھی کچھ گلے شکوے پیدا ہوئے ـــــ لیکن یہ اُن کی شرافت اور مروّت تھی کہ انہوں نے انہیں اپنے تک ہی رکھا اور کبھی کسی کے سامنے زبان نہ کھولی!

• اُن کی نقاہت کے بارے میں تو راقم کو علم تھا کہ تدریجاً بڑھ رہی ہے لیکن انتقال سے قبل

کوئی ایسی خاص علالت ہوئی ہی نہیں جسے "مرضِ وفات" کا نام دیا جاسکے لہٰذا اُن کے انتقال کی اطلاع بالکل اچانک ملی۔ صبح تک کوئی آثارِ موت کے نہ تھے، چنانچہ ان کے داماد برادرم محمد حنیف ورک جو اُن کے ساتھ ہی رہتے ہیں، معمول کے مطابق ڈیوٹی پر کالج گئے ہوئے تھے اور صاحبزادے حافظ قاسم رضوان بھی اتفاقاً ہی گھر پر تھے۔ بڑے صاحبزادے محمد حسن بھی اپنے کاروبار پر باہر تھے — کہ اچانک ۱۱ جنوری ۱۹۸۶ء کو ۱۱ بجے دن کے لگ بھگ حاجی صاحب انتہائی خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوگئے! گویا اُن کی بے چین روح کو جگر کے اِس مصرعے کے مطابق ع "عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا" ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سکون حاصل ہوگیا!

ع "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!"

• راقم جب اُسی روز بعد نماز مغرب ان کی نماز جنازہ ادا کر رہا تھا تو دل میں عجیب سی حسرت کا احساس پیدا ہُوا کہ کاش گذشتہ چند دنوں کے دوران حاجی صاحب سے ایک ملاقات ہوجاتی تو راقم اپنے ایک اقدام کی وضاحت کرسکتا جس سے انہیں شکایت پیدا ہوئی تھی۔ اِس لیے کہ گذشتہ پندرہ سال کے دوران راقم کو متعدد بار تجربہ ہو چکا تھا کہ حاجی صاحب کو کوئی شکایت پیدا ہوئی اور جیسے ہی میں حاضر ہُوا ساری شکایت کافور ہوگئی۔

— بلکہ بعض اوقات تو محسوس ہُوا کہ حاجی صاحب خفگی کا اظہار کرتے ہی اِس لیے ہیں کہ میں اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر اُن کی خدمت میں حاضری دے سکوں! — وہ ہر اعتبار سے میرے "بزرگ" تھے، (عمر میں تو میرے والد صاحب مرحوم سے بھی چار سال بڑے تھے!) لیکن وہ جس ادب و احترام ہی نہیں "تعظیم" کے ساتھ مجھ سے پیش آتے تھے اُس سے بہت شرمندگی ہوتی تھی اور بعض اوقات اِسی کا احساس اُن کی خدمت میں حاضری سے مانع ہوجاتا تھا، —

بہرحال ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہم سب کو لوٹ جانا ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت اور فضل و کرم کے سائے میں جگہ دے — اور "وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ" کا مصداق بنادے — اَللّٰھُمَّ اٰمِیْن!!

ان شاء اللہ العزیز ـــــ دوران سال ۸۶ - ۱۹۸۵ء

تنظیمِ اسلامی پاکستان کا

پانچواں علاقائی اجتماع بمقام ملتان

۲۲ تا ۲۵ فروری ۸۶ منعقد ہوگا

جس میں ۲۲ اور ۲۳ کی رات کو بعد نماز عشاء امیر تنظیم کا خطابِ عام بعنوان:

"پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟"

ہوگا اور ۲۴ کی رات کو اس موضوع پر سوالات کے جوابات دیئے جائیں گے، نیز ۲۳ تا ۲۵ روزانہ ۸ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر تربیتی دروس و خطابات ہونگے۔

★ اس اجتماع میں جنوبی پنجاب کے اضلاع لاہور کارڈ، ساہیوال، وہاڑی، ملتان، فیصل آباد، جھنگ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں، بہاول نگر، بہاولپور اور رحیم یار خاں) کی تمام تنظیموں سے متعلق اور متفرد رفقاء کی شرکت لازمی ہے۔

★ کوئٹہ کے رفقاء کیلئے یہی اجتماع سالانہ اجتماع کے قائم مقام ہوگا لہذا وہاں کے جملہ رفقاء کی شرکت بھی لازمی ہے۔

★ جو رفقاء تنظیم کسی سبب سے اس سال کسی بھی علاقائی اجتماع میں شرکت نہ کر سکے ہوں انکے لئے بھی اس اجتماع میں شرکت لازمی ہے بصورت دیگر انکے تنظیم سے اخراج کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے!

★ گذشتہ سالانہ اجتماع میں امیر تنظیم نے ہدایت فرمائی تھی کہ ہر رفیق اس سال کے دوران کم از کم دو علاقائی اجتماعات میں ضرور شرکت کرے لہذا جن حضرات کے تا حال صرف ایک اجتماع میں شرکت کی ہو وہ بھی اس میں شرکت کی کوشش کریں!

★ رفقاء ۲۲ فروری کو مغرب سے قبل سرور پتہ درج ذیل پر پہنچ جائیں۔ ۲۵ کو دوپہر کے وقت اجتماع کی کاروائی ختم ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر حافظ غلام حیدر خاں ترین، امیر تنظیم اسلامی، ملتان

۲۵۔ آفیسرز کالونی نزد لاسال ہائی اسکول، ملتان (فون: ۳۰۴۵۱)

ڈاکٹر اسرار احمد کی زیرِ تالیف تصنیف

استحکام پاکستان

شائع شدہ ــــ جنوری ۱۹۸۶ء

مقدّمہ

۱۔ پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال
۲۔ چند ذاتی وضاحتیں

اس شمارے میں

باب اوّل

پاکستان کا عدمِ استحکام:
حقیقی و واقعی یا وہمی و خیالی؟

باب دوم

پاکستان کی اصل اساس

باب سوم

استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بنیاد

نزلہ، کھانسی اور زکام
سردی کے موسم میں عام

مناسب احتیاط برتیئے ۔ بروقت سُعالین لیجیے

سردیوں میں اگر آپ کو نزلہ، زکام، کھانسی یا گلے میں خراش کی شکایت ہو جائے تو فوراً سُعالین کا باقاعدہ استعمال شروع کر دیجیے۔ اور اگر خدانخواستہ تکلیف بڑھ جائے تو ایک پیالی تیز گرم پانی میں سُعالین کی چار ٹکیاں حل کر کے جوشاندے کے طور پر صبح و شام پیجیے۔

سُعالین آپ کو ان بیماریوں سے محفوظ بھی رکھتی ہے اور نجات بھی دلاتی ہے۔

باب اوّل

پاکستان کا عدم استحکام

حقیقی وواقعی یا وہمی وخیالی ؟

عالمی سطح پر پاکستان کا شمار بالعموم غیر مستحکم یا بالقوّہ مائل بہ انتشار خطّوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر زائرنگ جو طویل عرصے تک پاکستان میں مقیم رہے اور پاکستان کے اعلیٰ ترین سرکاری تربیتی ادارے (اسٹاف کالج لاہور) سے وابستہ رہے، اُن کا ایک مضمون غیر ملکی جرائد کے حوالے سے پاکستان کے اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے برملا اور واشگاف الفاظ میں اِن خیالات کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان تا حال اپنے جُداگانہ تشخّص کا جواز ثابت نہیں کر سکا ہے لہٰذا عنقریب مزید حصّے بخرے ہونے کے عمل سے دوچار ہو جائے گا!۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک!!

اِدھر داخلی طور پر ایک جانب تو بانیٔ پاکستان کا یہ جُملہ تمام ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلسل نشر ہوتا ہے کہ "پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنا ہے!" اور دوسری طرف صورتِ واقعی یہ ہے کہ ذرا ہوا تیز چلتی ہے تو پاکستان کی کشتی ہچکولے کھانے لگتی ہے اور سیاسی حالات میں ذرا مدّ وجذر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو خواص وعوام سب کے ذہن ہی نہیں زبان تک پر یہ سوال آجاتا ہے کہ "پاکستان باقی بھی رہے گا یا نہیں ہے"

لہٰذا اِس امر کا پُوری حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آیا پاکستان کا مبینہ عدم استحکام حقیقی اور واقعی ہے یا ؎ "یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی!" کے مصداق محض دشمنوں کی اِس سازش کا مظہر ہے کہ اِس طرح پاکستان کی مسلمان قوم کے دِلوں میں بے یقینی کی کیفیت پیدا کر کے اجتماعی قوتِ ارادی (COLLECTIVE WILL) کو مضمحل کیا جائے!

راقم کے تجزیے کے مطابق پاکستان کا عدم استحکام وہمی وخیالی نہیں حقیقی وواقعی ہے اور

اِس کے دلائل اور شواہد ہمارے ماضی اور حال دونوں میں جا بجا موجود ہیں۔ اور جہاں تک "پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے" یا اِس قسم کے دوسرے اقوال کا تعلق ہے تو یہ اگرچہ ع "تری آواز مکّے اور مدینے" کے مصداق نہ صرف پاکستان بلکہ پُوری دنیا کے ایک ایک مسلمان کے دِل کی تمنّا اور آرزو ہے لیکن اِس معاملے میں حقائق کا انداز بالکل قرآن حکیم کے الفاظِ مبارکہ "تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ" کا سا ہے! (سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۱: "یہ اُن کی خواہشات ہیں، کہیے پیش کرو اپنی دلیل اگر تم سچے ہو!"

تو آیئے کہ ذرا اُن حقائق کا جائزہ لیں!

۱۔ سانحۂ مشرقی پاکستان

سب سے پہلی تلخ حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ پاکستان جو ۱۹۴۷ء میں عالمِ وجود میں آیا تھا اب کہاں ہے؟ اُس نے تو چودہ سال قبل داستانِ پارینہ کی صورت اختیار کر لی تھی اور اب اُسے "PAKISTAN THAT WAS!" کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو اِس "جو تھا نہیں ہے" پر "جو ہے نہ ہوگا" کو کس دلیل سے بعید از قیاس قرار دیا جا سکتا ہے؟[1]

یاد کیجیے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحہ پر صرف ملّتِ اسلامیہ پاکستان ہی نہیں پُورا عالم اسلام ہل کر رہ گیا تھا، اور جہاں پُوری اُمّت مسلمہ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا وہاں لاکھوں انسان دھاڑیں مار مار کر روئے تھے۔ یہاں تک کہ حرمین شریفین کی فضا لوگوں کی آہ و بکا اور نالہ و شیون سے گونج اُٹھی تھی۔ اِس لیے کہ اُس موقع پر صرف یہی نہیں ہوا تھا کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیٰحدہ ہو گیا تھا، اگر بات صرف اتنی ہوتی تو اتنا عظیم صدمہ نہ ہوتا۔ بلکہ اِس علیٰحدگی کے جلو میں اُس بدترین شکست کا کلنک کا ٹیکہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی پیشانی پر لگا تھا جسے تاریخ عالم کی عظیم ترین ہزیمتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے، خلافت کی منسوخی اور عالمِ عرب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اَغیار کے غلبہ و تسلط میں جکڑے جانے کے جو کچوکے اُمّتِ مرحومہ کو لگے تھے، اُس کے درد و الم میں صدی کے وسطی حصّے میں مختلف ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کی کامیابی سے کچھ کمی آئی ہی تھی اور زخم کچھ مندمل ہوئے ہی تھے کہ ۱۹۶۷ء میں دُولِ عرب کی شرمناک

---

[1] ع "جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ" اقبال

اور ذلّت آمیز شکست اور پھر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں دُنیا کی عظیم ترین مسلمان مملکت کی رُسوا کن ہزیمت نے زخموں کو از سرِ نو تازہ ہی نہیں مزید گہرا کر دیا۔ اور ان زخموں پر نمک چھڑکنے کی خدمت ہمارے اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے اِس طرح سرانجام دی کہ اپنا نام ہی بدل ڈالا اور 'پاکستان' کے لیبل کو اپنی پیشانی سے اُتار کر خلیج بنگال میں پھینک دیا اور اس طرح اپنی کم از کم گذشتہ پینسٹھ سال کی تاریخ سے اعلان برأت کر دیا (واضح رہے کہ مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ ہی میں عمل میں آیا تھا) اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ 'بنگلہ دیش' کے پہلے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر کمال حسین نے اعلان کیا کہ "اگرچہ آبادی کے لحاظ سے اِس وقت دُنیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد بنگلہ دیش میں ہے لیکن ہم بنگلہ دیش کو ایک 'مسلمان ملک' کہلوانا پسند نہیں کریں گے" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! گویا کم از کم وقتی طور پر تو پاکستان ہی سے نہیں اسلامی تشخّص سے بھی بیزاری پیدا ہو گئی تھی!

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی بقا اور تسلسل کے لیے ذہنِ انسانی میں نسیان اور بھول کا حفاظتی آلہ (SAFETY VALVE) لگا رکھا ہے۔ ورنہ "یادِ ماضی عذاب ہے یارب! چھین لے مجھ سے حافظہ میرا!" کے مصداق زندگی اجیرن ہو جاتی، اس لیے کہ اب بھی جب کبھی خیال آجاتا ہے کہ ہمارے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل جوان اُن ہندوؤں کے قیدی بن گئے تھے جن پر ہم نے تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی تو دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور خصوصاً جب وہ نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ پاکستان کی فوج اور دیگر سروسز کے جوانوں اور افسروں کو بالکل بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ٹرکوں پر لاد کر مشرقی پاکستان سے وسطی ہند (مدھیہ پردیش) کے نظربندی کے باڑوں (CONCENTRATION CAMPS) تک لے جایا گیا تھا تو دِل خون کے آنسو روتا ہے اور رنج والم کی کوئی حد نہیں رہتی ——— ایک مختصر سی جنگ کے نتیجے میں اتنی بڑی شکست اور خصوصاً اتنی ذلّت و رُسوائی کی تاریخ انسانی میں کم از کم راقم کی معلومات کی حد تک تو صرف ایک ہی مثال ملتی ہے اور وہ ہے چھٹی صدی قبل مسیح میں بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی اور اُس کے بعد چھ لاکھ یہودیوں کا بھیڑوں اور بکریوں کے گلّوں کے مانند ہانک کر بابل لے جایا جانا۔ راقم کے نزدیک ہمارا المیہ اُس سے ہرگز کم نہیں اس لیے کہ اُن چھ لاکھ میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے

اور بوڑھے بھی تھے اور جنگ کے قابل مردوں کی تعداد ہرگز ایک لاکھ سے متجاوز نہیں ہوسکتی!

بہرحال سقوطِ مشرقی پاکستان کا حادثہ فاجعہ پاکستان کے عدم استحکام کا منہ بولتا ثبوت ہے اور آئندہ کے لیے ایک تازیانۂ عبرت کے طور پر مناسب ہے کہ اس کی یاد کبھی کبھی تازہ کرلی جائے ؎

"تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!"

۲۔ سرزمینِ بے آئین

پاکستان کے عدم استحکام کا دوسرا جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ قمری تقویم کی رُو سے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھ چکنے کے باوجود یہ ملک تاحال سرزمینِ بے آئین کی حیثیت رکھتا ہے اور ع "خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری" کے مصداق بے آئینی ہی اس کا آئین اور بے دستوری ہی اس کا دستور ہے۔!

راقم الحروف اپنے زمانہ طالب علمی میں جبکہ وہ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا ناظم اعلیٰ تھا عزم کے نام سے جمعیت کے سرکاری جریدے (ORGAN) کی ادارت کا ذمہ دار تھا۔ اس میں ایک صفحہ مستقل طور پر پاکستان کے زیرِ تدوین دستور کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین اور خطوط کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور اُس کا عنوان اِس شعر کو بنایا گیا تھا کہ ؎

"اِس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں، اِس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئین گلستاں کیا ہوگا، دستورِ بہاراں کیا ہوگا"

ذرا تصور کیجیے کہ یہ ۵۲-۱۹۵۳ء کی بات ہے گویا اس پر پوری ثلث صدی بیت چکی ہے لیکن آج بھی صورتِ حال جوں کی توں ہے اور اس میں ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد خان لیاقت علی خان مرحوم کی بی پی سی رپورٹ (BASIC PRINCIPLES COMMITTEE REPORT) کے رد ہو جانے کے بعد دستور سازی میں جو کئی سال کا وقفہ اور خلا رہا تھا وہ خدا خدا کر کے ۵۶ء میں ختم ہوا تھا لیکن ۵۶ء کے دستور کو واقعتہً دن کی روشنی دیکھنی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ پھر ۶۲ء کا دستور آیا اور صرف چند سال قائم رہ کر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ۷۳ء میں سر بھٹو نے واقعتہً ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا کہ دن رات محنت کر کے اس پارلیمنٹ کا اتفاق رائے (CONSENSUS) حاصل کر لیا تھا جس کی نمائندہ حیثیت غیر متنازعہ تھی، یہاں تک کہ آج تک بھی اُس کے بارے میں اِس پہلو سے کسی نے حرف زنی نہیں کی کہ جن انتخابات کے ذریعے وہ وجود میں آئی تھی وہ قابل اعتماد

نہ تھے! لیکن افسوس کہ اوّلاً خود انہوں نے اس میں پَے بہ پَے ترامیم کر کے اُس کا حلیہ بگاڑ دیا اور اُس کی غیر متنازعہ حیثیت کو بھی مجرُوح کر دیا۔ اور اِس سلسلے میں وہ اپنی مجرّد عددی قوّت (BRUTE MAJORITY) کو جس بھونڈے طور پر بروئے کار لائے اُس نے واقعہ یہ ہے کہ اُن کی اپنی حیثیت کو شدید نقصان پہنچایا۔ اور پھر ۷۷ء کے مارشل لار نے اُسے اوّلاً ساڑھے آٹھ سال تک معطل رکھا اور پھر ترامیم کے ذریعے اُس کے پُورے نقشے ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ اور اگرچہ حال ہی میں اُس پر طویل بحث و مباحثہ اور گفت و شنید اور "کچھ لو اور کچھ دو" (GIVE AND TAKE) کے اصُول پر سمجھوتے کے بعد پارلیمنٹ سے مہرِ تصدیق ثبت کرالی ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ اِس پارلیمنٹ کی حیثیت ہرگز غیر متنازعہ نہیں ہے اور مارشل لاء اُٹھنے کی دیر ہے کہ اس کے ضمن میں پُورا الجھا اختلاف و انتشار (PANDORA'S BOX) ایک دَم کھل جائے گا اور آزادانہ تصادم و کشمکش (FREE FOR ALL) کی وہ کیفیت دوبارہ پیدا ہو جائے گی جو سن ۶۹ء میں پیدا ہو چکی ہے اور پھر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اِس صورتِ حال کا نتیجہ کیا برآمد ہو گا! اِس لیے کہ اتنی بات تو ریکارڈ پر موجُود ہے اور سب ہی کو معلوم ہے کہ ملک کی متعدد سیاسی جماعتوں اور اہم سیاسی شخصیتوں نے بارہا کہا ہے کہ اگر ایک بار ۷۳ء کا دستور ختم ہو گیا تو پھر دوبارہ پاکستان کا دستور کبھی نہ بن سکے گا۔ واللہ اعلم !!۔ واعاذنا اللہ من ذلک !!!

۳۔ کنفیڈریشن کا شوشہ

عدمِ استحکام کا ایک تیسرا مظہر۔ اور مسلسل بے دستوری اور بے آئینی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اب ملک کے متعدد اور مسلّم سیاسی اہمیت کے حامل رہنما برملا کنفیڈریشن کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس کے لیے ایک باضابطہ "اتحاد" "سندھی، بلوچی، پختون فرنٹ" کے نام سے وجُود میں آچکا ہے۔ اور یہ فرنٹ تو ملک سے باہر بنا ہے اور اس میں شریک زعماء اس وقت خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن عین باب الاسلام یعنی سندھ کے قلب میں بیٹھ کر ایک شخص اس سے بھی آگے بڑھ کر برملا کہہ رہا ہے کہ "اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان کو توڑ دیا جائے!" اور کنفیڈریشن کے نعرے پر طنزیہ تبصرہ کرتا ہے "ہمیں کنفیڈریشن ضرور مطلوب ہے، لیکن پاکستان کے اندر نہیں بلکہ اس سے باہر!!" اور اس سے بھی ایک قدم مزید آگے بڑھا کر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ: "ہم مارشل لاء کی تائید اسی لیے کرتے ہیں کہ اصل میں پاکستان اسی کے ذریعے ٹوٹے گا! اور ہم ایم آر ڈی کی تائید اس لیے نہیں کرتے کہ وہ جمہوریت کی علمبردار ہے اور جمہوریت پاکستان کے

بقا کا ذریعہ بن جائے گی !"۔ واضح رہے کہ مجھے اس وقت اُن صاحب کے کسی قول کی صحت یا عدم صحت سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ یہ تذکرہ صرف ع "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا" کے قبیل سے ہے!

۴۔ بھارت کا استحکام

عربی مقولے "تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا" (چیزوں کی حقیقی معرفت اُن کی مخالف اور متضاد اشیاء کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے!) کے مطابق اپنی اس حالت کا موازنہ کیجیے بھارت کے ساتھ، جو پاکستان کا پیدائشی دشمن ہے۔ اِس لیے کہ اُس نے ذہناً اور قلباً پاکستان کو ایک دن کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔ کون نہیں جانتا کہ ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے بھارت کی موجودہ تقسیم عارضی ہے اور اُن کے دِلوں میں اِس اُمید کے چراغ روشن ہیں کہ وہ دِن زیادہ دُور نہیں جب بھارت پھر 'اکھنڈ' ہو جائے گا۔ اُن کے صحافی اور دانشور پاکستان آکر برملا کہتے ہیں کہ "ہم نے پاکستان کو تو ضرور تسلیم کیا ہے، لیکن نظریۂ پاکستان کو ہرگز تسلیم نہیں کیا!" یہ گویا نہایت لطیف اور ڈپلومیٹک انداز ہے یہ کہنے کا کہ ہم پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے۔

غور طلب امر ہے کہ بھارت بھی ہمارے ہی ساتھ —— بلکہ ہم سے ایک دن بعد۔ آزاد ہوا تھا لیکن اُس نے جھٹ پٹ دستور بنایا اور اس کی گاڑی ایمرجنسی کے ایک مختصر سے وقفے کے سوا چالیس سال ہونے کو آئے کہ کبھی اُس دستور کی پٹڑی سے نہیں اُتری۔ حالانکہ وہ اگر ہم سے دس گنا بڑا ہے تو اُس کے مسائل ہم سے پچاس گنا زیادہ پیچیدہ اور گھمبیر ہیں۔ چنانچہ نسلی ولسانی اور تہذیبی و ثقافتی تقسیم تو وہاں پاکستان کے مقابلے میں کم از کم دس گنا زیادہ ہے ہی، اس پر مستزاد ہے وہ مذہبی تقسیم جس نے وہاں کے مسائل کو مزید کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں کم از کم اِس 'بچے کھچے پاکستان' (WHAT REMAINS OF PAKISTAN) میں یہ عامل نہ ہونے کے برابر ہے۔!! —— الغرض معاملہ وہی ہے کہ ؎

"دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ!"

آئینی اور دستوری سطح پر بھارت کی اِس 'پختہ زناری' کے ساتھ ساتھ ایک نظر ڈالیے اُس کی صنعتی اور عسکری ترقی پر جس نے اُسے اِس علاقے کی چھوٹی سُپر پاور کا درجہ دے دیا ہے اور غور کیجیے اِس واقعی صورتِ حال پر کہ دونوں عالمی طاقتیں اُس کی خوشنودی کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہیں۔ چنانچہ جناب آغا شاہی جو غالباً پاکستان کی تاریخ میں

طویل ترین عرصے تک پاکستان کے وزیر خارجہ رہے ہیں اپنی ایک تحریر میں صاف لکھ چکے ہیں کہ اجیو گاندھی کے دورۂ امریکہ کے موقع پر یہ طے پا گیا ہے کہ امریکہ بھارت کو جنوبی ایشیا کی منی سپر پاور (MINI SUPER POWER) تسلیم کرتا ہے اور اُس کی اِس حیثیت کو کسی بھی اعتبار سے نہ چیلنج کرے گا نہ مجروح کرنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ وہ وقت قریب ہے کہ امریکہ پاکستان کو مجبور کر گیا کہ وہ بھارت کے ساتھ اُس کی شرائط پر صلح کرے! الغرض! بھارت کا یہ استحکام بھی پاکستان کے عدمِ استحکام کے ضمن میں ایک تقویتی عامل کی حیثیت رکھتا ہے!

عدمِ استحکام کا سبب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ع "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا" کے مصداق اِس عدمِ استحکام کا سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کا ایک سبب اصلی اور بنیادی ہے اور ثانوی درجے میں اِس اساسی سبب کے کچھ ثمرات و نتائج ہیں جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے!

اِس کا اصل سبب یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے عالم وجود میں آیا تھا لیکن افسوس کہ اس میں بسنے والوں نے اس کے وجود میں آنے کے فوراً بعد اُس نظریئے ہی کو فراموش کر دیا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی درخت کی جڑ سوکھ جائے اور اُسے پانی نہ دیا جائے! اس کے نتیجے میں وہ لازماً مرجھا جائے گا! اُس کے پتے جھڑ جائیں گے، شاخیں سوکھ جائیں گی اور کچھ عرصے بعد اُس میں سے ایک سوکھے تنے کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا! چنانچہ بعینہٖ یہی صورتِ حال پاکستان کو درپیش ہے۔

اِس سے بھی آگے بڑھ کر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کا حصول برِصغیر کی ملّتِ اسلامیہ کے قافلۂ ملّی کی اصلی اور آخری منزل نہیں بلکہ صرف پہلا پڑاؤ تھا! اور اِس امر کی شدید ضرورت تھی کہ اِس کے قافلہ سالار اپنے شرکاءِ سفر کو پوری شدت سے یاد دلاتے رہتے کہ ع "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی"! لیکن افسوس کہ اِس بدنصیب قافلے کے رہنماؤں کی اکثریت نے خود ہی پہلے پڑاؤ پر پہنچ کر اصل منزل کو فراموش کر دیا چنانچہ جب خود رہنما ہی اُس پڑاؤ کو اصل منزل قرار دے کر محوِ استراحت ہو گئے تو عوام کا تو کہنا ہی کیا؟ اُن کی اکثریت نے بھی اگر ع "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ

نیست!" کی عامیانہ شرح کو طرزِ زندگی بنا لیا تو اُن سے کیا گلہ ہے اور کیسا شکوہ!!

اِس اصل اور اساسی سبب کے نتیجے میں جب ذہنی و فکری انتشار، اخلاقی و عملی اختلال اور سیاسی و انتظامی بحران پیدا ہوا تو اوّلاً کچھ ہوشیار اور چالاک سرکاری ملازمین (CIVIL SERVANTS) نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور جب اُسکے نتیجے میں ع "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی" کے مصداق انتشار و اختلال مزید بڑھ گیا تو آخر کار ملک کے منظم ترین ادارے یعنی فوج نے عوام کو سیاسی اعتبار سے نابالغ اور سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو بدقماش اور آوارہ قرار دے کر ملک و ملّت کی سرپرستی (GUARDIANSHIP) کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اِس سے بھی صورتحال میں کوئی بہتری تو نہ پیدا ہو سکتی تھی نہ ہوئی!! لیکن اس کی کوکھ سے مزید پیچیدگیوں اور خرابیوں نے جنم لے لیا۔ جن میں سے سب سے بڑی اور خوفناک پیچیدگی یہ ہے کہ چونکہ پاکستان کی مسلح افواج کی ایک عظیم اکثریت ایک خاص علاقے سے تعلّق رکھتی ہے لہٰذا دوسرے علاقے کے لوگوں میں یہ احساس کچھ از خود اُبھرا اور کچھ ملک و ملّت کے دشمنوں نے اُبھارا کہ ایک علاقے کے لوگ پورے پاکستان پر حکومت کر رہے ہیں! چنانچہ اوّلاً یہ احساس پوری شدّت کے ساتھ مشرقی پاکستان میں پیدا ہوا اور اُس کے نتیجے میں ملک دولخت ہو گیا! بعد ازاں یہی احساس ہے جس کی کوکھ سے اِس بچے کھچے پاکستان میں سندھی، بلوچی، پختون فرنٹ، نے جنم لیا ہے اور اگر خدانخواستہ ان ثانوی اثرات و نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے ساتھ ساتھ جلد از جلد پاکستان میں ایک زوردار تحریک ایسی نہ اُبھری جو ع

"سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!"

کے انداز میں اِس بھولے اور بھٹکے ہوئے قافلے کو اپنی اصل منزل دوبارہ یاد دلا دے اور ع

"ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!"

کی شان کے ساتھ ایک "ولولۂ تازہ" اور "عزمِ نو" کے ساتھ دوبارہ سرگرمِ سفر کر دے تو اندیشہ ہے کہ کہیں بدخواہوں کی پیشین گوئیاں صحیح ثابت نہ ہو جائیں اور دشمنوں کے گھروں میں واقعتہً گھی کے چراغ نہ جلنے لگیں!

تو آیئے کہ غور کریں کہ:-

پاکستان کی اصل جڑ اور بنیاد کیا ہے؟ اور اس کے استحکام کی بنیاد کون سی چیز بن سکتی ہے؟

باب دوم

پاکستان کی اصل اساس

عالمی سطح پر بھی عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم ہوا ہے (بلکہ اس ضمن میں بالکل غلط طور پر اسرائیل کا نام بھی پاکستان کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا ہے) اور اندرونِ ملک بھی یہ بات اتنے زور شور، اس قدر شدّومد اور اس درجہ تکرار و اعادہ کے ساتھ کہی گئی ہے کہ اب عام طور پر تو اس جانب دھیان ہی نہیں دیا جاتا اور بہت سے لوگوں کو اس سے متلی کی سی کیفیت (NAUSEA) کا احساس ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ منبر و محراب سے تو یہ صدا تقریباً مسلسل ہی بلند ہوتی رہی ہے اور سیاست کے میدان کے بھی نیم سیاسی اور نیم مذہبی کھلاڑیوں نے اکثر و بیشتر اسی نعرے کا سہارا لیا ہے۔ لیکن گزشتہ آٹھ برسوں کے دوران خود ایوانِ حکومت سے یہ راگ جس تسلسل اور بلند آوازی کے ساتھ الاپا گیا ہے اس نے غالباً سب کو مات دے دی ہے! ——— (اگرچہ اکثر سیاسی مبصرین کی رائے یہ ہے کہ اب یہ نعرہ اپنی معنویت اور تاثیر کھو چکا ہے)

دوسری جانب گاہے گاہے کچھ دوسری باتیں بھی سننے میں آتی رہتی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان ہرگز مذہب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا۔ اس کے وجود میں آنے کے اصل اسباب خالص سیاسی تھے یا خالص معاشی!

جہاں تک یادداشت ساتھ دیتی ہے اس بات کو برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہنے والی پہلی سیاسی شخصیت جناب حسین شہید سہروردی کی تھی، جنہوں نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان خالص معاشی اسباب کی بنا پر قائم ہوا ہے۔ تاہم اُن کی بات کو زیادہ اہمیت اس لیے نہیں دی گئی تھی کہ وہ بذاتِ خود ایک متنازعہ شخصیت تھے اور قیامِ پاکستان کے تقریباً فوراً بعد ہی انہوں نے مسلم لیگ سے کٹ کر اپنی

علیحدہ سیاسی جماعت قائم کر لی تھی لیکن کچھ عرصے بعد جب جناب نورالامین نے بھی ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ میں شائع شدہ ایک طویل انٹرویو میں اِسی رائے کا اظہار کیا تو اِس کا وزن محسوس کیا گیا اور سوچنے سمجھنے والوں نے کم از کم یہ ضرور محسوس کیا کہ بات غور و فکر کے قابل ہے۔

ان دونوں حضرات کی یہ "متفق گردید رائے بو علی با رائے مَن" کے مصداق متفق علیہ بات اِس لیے بھی اہمیت اختیار کر گئی کہ ان دونوں کا تعلق متحدہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے سے تھا، مزید برآں اُسی کے صدر مقام ڈھاکہ کو مسلم لیگ کے 'مولد' (جائے ولادت) کی حیثیت حاصل تھی اور وہیں مسلم لیگ نے نہ صرف یہ کہ ابتدائی نشو و نما پائی تھی بلکہ طویل عرصے تک حکومت بھی کی تھی۔ مزید برآں یہ صوبہ وہ تھا جو تقسیم ہند سے بہت قبل ایک بار صوبائی تقسیم کا تجربہ بھی کر چکا تھا۔ الغرض اُن دونوں حضرات کی بات ہرگز ایسی نہ تھی کہ نظر انداز کر دی جاتی۔ چنانچہ پاکستان کی نئی نسل نے بلاشبہ اِن حضرات کی بات کا اثر قبول کیا۔

یہ دونوں بزرگ تو عرصہ ہوا اِس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ بدقسمتی سے گزشتہ دو تین برسوں کے دَوران دو اور بزرگ شخصیتوں کی جانب سے بھی اِس سے ملتی جلتی رائے سامنے آئی ہے۔ اگرچہ اِس بار جو لفظ استعمال ہُوا وہ 'معاشی' نہیں 'سیاسی' ہے۔ چنانچہ پہلے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ تحریک پاکستان ہرگز ایک مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ خالص سیاسی تحریک تھی، اور جب اُن پر لے دے ہُوئی تو انہوں نے جو وضاحتیں اور معذرتیں پیش کیں وہ بالکل "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کا مصداق تھیں نتیجۃً جس قدر وہ وضاحتیں پیش کرتے گئے اتنے ہی دلدل میں مزید پھنستے چلے گئے۔ بعد ازاں جناب سردار شوکت حیات خاں صاحب سامنے آئے اور انہوں نے یہ فرما کر کہ "پاکستان کا مطلب کیا ہے لا الٰہ الا اللہ! ہرگز کوئی سنجیدہ اور سوچی سمجھی بات نہیں تھی بلکہ یہ نعرہ تو چند چھوکروں نے ایجاد کیا تھا!" گویا بات ہی ختم کر دی!

کسی کو ان دونوں حضرات کی رائے خواہ کتنی ہی غلط نظر آئے اِس حقیقت کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دونوں تحریک پاکستان کے کارکنوں اور قائدِ اعظم کے نوجوان ساتھیوں میں شامل تھے اور فی الوقت دونوں ہی کا شمار موجودہ بچے کھچے پاکستان کے بزرگ ترین سیاستدانوں میں ہوتا ہے۔ مزید برآں دونوں کا تعلق اُس صُوبے سے ہے جو موجُودہ پاکستان میں ہر اعتبار سے عظیم ترین ہے!

اِس صورتِ حال کا خوفناک ترین نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ع "شدٗ پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا !"
کے مصداق پاکستان کی نئی نسل شدید ذہنی و فکری انتشار (CONFUSION) کا شکار ہے اور
اُسے نہ اپنے تشخص کا شعور حاصل ہو سکا ہے نہ کسی مقصد یا منزل ہی کا سراغ مل سکا ہے' اور اس کی
حالت کم و بیش اُس مسافر کی سی ہے جو گھر سے تو کسی معیّن کام کے لیے کسی شہر کے سفر کے لیے چل
پڑا ہو لیکن اثنائے سفر میں کسی حادثے کے باعث اُس کی یادداشت زائل ہو جائے اور اب اُسے
نہ یہ یاد ہے کہ میرا گھر کہاں ہے اور مَیں نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا ؟ اور نہ یہ یاد رہے کہ مَیں جا
کہاں رہا ہوں اور وہاں مجھے کام کیا کرنا ہے ؟

لہٰذا اِس امر کی شدید ضرورت ہے کہ پوری سنجیدگی اور زیادہ سے زیادہ حقیقت و واقعیت پسندانہ
(REALISTIC) اور ممکنہ حد تک معروضانہ (OBJECTIVE) انداز میں غور کیا جائے کہ قیامِ
پاکستان کا اصل سبب کیا تھا ؟ تحریکِ پاکستان کے اصل محرکات کیا تھے ؟ ۔ اور وطنِ عزیز کی کوئی حقیقی
اور واقعی جڑ بنیاد ہے بھی یا نہیں ؟

اور اِس جائزے اور تجزیے کے دَوران ضرورت ہو گی کہ نہ حقائق کو مسخ کیا جائے ، نہ کسی
'آرزُومندانہ اندازِ فکر' (WISHFUL THINKING) کو دخل انداز ہونے کا موقع دیا جائے ، نہ
کسی شخصیت کی عظمت اور محبّت و عقیدت کو حائل ہونے دیا جائے اور نہ کسی کی ناراضگی یا رضامندی
کا لحاظ کیا جائے بلکہ اصل حقائق کو جرأت و ہمّت کے ساتھ خود بھی قبول کیا جائے اور پوری جرأتِ رِندانہ
کے ساتھ اُن کا ڈنکے کی چوٹ اظہار و اعلان بھی کیا جائے !

اِس نہایت پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسئلے کے حل کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ پہلے اِس کی تین
جداگانہ سطحوں (LEVELS) کا شعور حاصل کر لیا جائے اور پھر ہر سطح پر حقیقت کے جزوی ادراک کے بعد
حقیقتِ کُلّی کی جانب پیشقدمی کی جائے !

اِس مسئلے کی تین جداگانہ سطحوں کے لیے بہترین تمثیل زمین پر پانی کی تین مختلف سطحوں کی صورت میں
موجود ہے ۔ چنانچہ ایک پانی وہ ہے جو سطحِ زمین پر دریاؤں اور ندی نالوں کی صورت میں بہہ رہا ہے ۔
سب جانتے ہیں کہ وہ ظاہر و باہر پانی جو ہر انسان کو بچشمِ سر نظر آتا ہے یہی ہے' پانی کی دوسری سطح وہ

ہے جہاں سے اُسے کنوؤں اور ہینڈ پمپوں وغیرہ کے ذریعے نکالا جاتا ہے اور اس کے سوتے کہیں تیس چالیس فٹ گہرائی پر چل رہے ہوتے ہیں کہیں ستّر اسّی فٹ کی گہرائی پر اور کہیں اس سے بھی نیچے، اور از منۂ قدیم سے ماضی قریب تک دریاؤں اور ندیوں سے بُعد اور فاصلے پر انہی زیر زمین سوتوں کا پانی بقائے حیات کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ جبکہ پانی کی تیسری سطح وہ ہے جو سطح زمین سے کئی سو فٹ نیچے ہے اور جہاں سے زمانۂ حال میں پینے کے لیے صاف و شفاف پانی ٹیوب ویلوں کے ذریعے نکالا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح پاکستان کی 'ایجاد' یا 'تکوین' (GENESIS) کے اسباب یا محرکات کو بھی بالکل تین علیحدہ سطحوں (LEVELS) پر سمجھا جا سکتا ہے:

اس کی پہلی اور نمایاں ترین سطح یہ ہے کہ "پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا!" چنانچہ یہ ظاہر و باہر، حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، بجز اس کے کہ کوئی سخت ڈھٹائی ہی پر اُتر آئے۔ اور حقیقتِ واقعی کے انکار پر کمر کس لے۔ اس کی حیثیت اُس نوشتۂ دیوار (WRITING ON THE WALL) کی ہے جو ہر شخص کے سامنے رہتی ہو اور جس سے صرفِ نظر ممکن نہ ہو! یہی وجہ ہے کہ یہ بات پوری دنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی کو پسند ہو یا ناپسند!

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کو از درّۂ خیبر تا اس کماری اور از مکران تا چٹاگانگ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے والا نعرہ بہر صورت "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" ہی تھا اور اس سے ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ اس کے الفاظ بزرگوں نے متعیّن کیے تھے یا نوجوانوں نے ترتیب دے لیے تھے۔

پھر بات صرف ایک نعرے کی نہیں ہے بلکہ اُن واضح و غیر مبہم اور واشگاف و برملا بیانات و اعلانات کی ہے جن کے ذریعے پاکستان کے بانی و مؤسّس اور تحریکِ پاکستان کے 'قائدِ اعظم' نے مسلمانوں کی قومیّت کی اساس 'مذہب' کو، پاکستان کی منزل 'اسلام' کو اور پاکستان کا دستور 'قرآن' کو قرار دیا تھا اور قیامِ پاکستان کا مقصد یہ بیان کیا تھا کہ ہم پاکستان کے ذریعے عہدِ حاضر میں اسلام کے اصُول حریّت، مساوات اور اخوّت کی جدید تفسیر اور عملی نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں!۔ اس حقیقت سے انکار کوئی نہایت ڈھیٹ شخص ہی کر سکتا ہے کہ ان اعلانات کے بغیر نہ مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن سکتی تھی نہ برِّ صغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں بسنے والے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے تھے۔ یہ حقیقت اتنی

ظاہر و باہر اور سطح زمین پر بہنے والے دریاؤں اور ندیوں کے پانی کے مانند اتنی عیاں ہے کہ اس پر قلم و قرطاس کا مزید صَرف تحصیل حاصل کے ذیل میں آئے گا۔

تو اب آیئے دوسری سطح کی جانب جس کا صحیح تعین ایک سوال کی صورت میں کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ "تحریک پاکستان کا اصل جذبۂ محرّک کیا تھا؟"۔ ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ یہ سوال نہایت گہرا ہے اور اس کا جواب دینا آسان کام نہیں ہے!۔ مزید برآں یہ کہ اس سوال کے جواب میں پوری دیانت اور خلوص و اخلاص کے باوجود اختلاف کی بڑی گنجائش موجود ہے۔!

ان سطور کے عاجز و حقیر راقم کے نزدیک اس سوال کا ایک منفی جواب تو بادنیٰ تامل سامنے آسکتا ہے اور اس پر اتفاق (CONSENSUS) بھی زیادہ مشکل نہیں ہے البتہ تحریک پاکستان کے اصل محرّک کی مثبت تعیین واقعتہً آسان نہیں!

شاید بہت سے قارئین اس پر چونک جائیں اور حیران ہوں کہ راقم بھی اُن لوگوں کی رائے کو دُرست سمجھتا ہے جن کے نزدیک تحریک پاکستان کا اصل عامل اور جذبۂ محرکہ 'مذہبی' نہیں کچھ اور تھا۔ اس 'کچھ اور' پر تو گفتگو بعد میں ہوگی سرِدست راقم اپنے آپ کو اس دیانت دارانہ رائے کے اظہار پر مجبور پاتا ہے کہ تحریک پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ مذہبی نہیں تھا اور اُس کے نزدیک اس کا بالکل بیّن اور ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ تحریک پاکستان کی اصل قیادتِ عُلیا ہرگز "مذہبی لوگوں" پر مشتمل نہیں تھی اور اس قاعدۂ کلّیہ سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کسی تحریک کا اصل جذبۂ محرکہ سب سے زیادہ نمایاں اور 'گاڑھی' صُورت میں اُس کی قیادت میں نظر آنا لازم ہے۔!

یہ حقیقت اگرچہ کسی قدر تلخ ہے اور اس کا اظہار غالباً بہت سے لوگوں کو ناگوار بھی محسوس ہوگا لیکن ہمیں اپنی قومی زندگی کے چالیسویں برس میں تو اتنا 'بالغ' ہو جانا چاہیے کہ تلخ حقائق کا اعتراف ہی نہیں اعلان بھی کر سکیں۔

اس مرحلہ پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ شرافت و مروّت اور صداقت و دیانت جُداگانہ حقیقتیں ہیں اور 'مذہبیّت' ایک جُداگانہ حقیقت ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال 'ابوطالب' سے قطع نظر کہ اُن کا معاملہ اہلِ سنّت اور اہلِ تشیّع کے مابین مختلف فیہ ہے، مطعم بن عدی کی ہے جس نے سفرِ طائف سے واپسی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائش پر اپنی امان کے اعلان اور اپنے چھ بیٹوں

سمیت ہتھیار بند ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بحفاظت مکّہ میں داخلے کا اہتمام کیا تھا! اگرچہ وہ خود آخری وقت تک ایمان نہیں لایا اور اُس کی موت کفر و شرک ہی پر واقع ہوئی۔

اِسی طرح یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اِس وقت ہم ایک عوامی تحریک کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں زیرِ بحث 'مذہبیت' کا بھی وہ معیار اور تصوّر قابلِ لحاظ ہو گا جو عام مسلمانوں میں معروف و مشہور ہو نہ کہ کسی خاص دانشور کا اپنے ذہن و فکر سے تراشیدہ اور خود اختیار کردہ معیار و تصوّر۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو غالباً کوئی ایک شخص بھی اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکے گا کہ تحریکِ پاکستان کی اصل قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ نہ صرف یہ کہ اس وقت عوامی سطح پر مروّجہ تصوّرات کے مطابق 'مذہبی' لوگ نہ تھے بلکہ اُن کی اکثریت جدید دَور کی مروّجہ اصطلاح کے مطابق "PRACTISING MUSLIMS" پر بھی مشتمل نہ تھی!

اِس ضمن میں ایک فیصلہ کن مثال تو اُس واقعے کی صُورت میں سامنے آتی ہے جو راقم کو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے سنایا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں جالندھر میں مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کا جو اجلاس سکھوں کے ساتھ گفت و شنید کے اصُول طے کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا اور جس میں مسلم لیگ کے ۲۳ اعلیٰ ترین قائدین شریک تھے (چشتی صاحب نے بہت سے حضرات کے نام بھی تعیّن کے ساتھ لیے تھے جو میری نوٹ بک میں درج ہیں لیکن اس وقت اُن کا ذکر مناسب نہیں سمجھتا!) اُس میں جب مغرب کی نماز کا وقت آیا تو نماز کے لیے جو لوگ اُٹھے وہ کُل دو تھے: ایک بیگم مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور جو برقع پوشی کی حالت میں شریکِ اجلاس تھیں اور دوسرے خود پروفیسر یوسف سلیم چشتی جو اپنی ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ نواب سَر شاہنواز ممدوٹ کی علالت کے باعث اُن کے نمائندے کی حیثیت سے شریکِ اجلاس تھے! مَیں چشتی صاحب کی اس روایت کو قبول کرنے میں شاید کچھ تامّل کرتا لیکن جب مجھے یاد آیا کہ بالکل یہی کیفیت ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کے دن لاہور میں منعقد ہونے والی 'عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس' کے موقع پر پیش آئی کہ مغرب کی نماز کے وقت بھی اجلاس ایسے جاری رہا تھا جیسے کسی کو احساس ہی نہ ہو کہ کون سا وقت آیا اور گذر گیا۔ (اُس وقت غالباً واحد مستثنیٰ ذات شاہ فیصل شہید کی تھی جو مغرب کی نماز ادا کر کے تاخیر ہی سے اجلاس میں شریک ہوئے تھے) تو اِس واقعے کی صحت تسلیم کرنے میں بھی کوئی دِقّت پیش نہ آئی۔

دوسری نہایت پیاری بات وہ ہے جو پیر سید جماعت علی شاہؒ سے منسوب کی جاتی ہے کہ جب اُن پر کسی نے اعتراض کیا کہ آپ اتنی عظیم دینی و روحانی شخصیت کے حامل بلکہ لاکھوں کے دینی و روحانی مقتدا اور رہنما ہو کر ایک داڑھی منڈے شخص (مراد تھے قائداعظم مرحوم!) کے پیچھے کیسے لگ گئے اور آپ نے کیسے اُسے اپنا رہنما تسلیم کر لیا؟ تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "بھائی! میں نے محمد علی جناح کو اپنا دینی یا روحانی پیشوا نہیں مانا بلکہ صرف اپنے قومی مقدمے کے لیے ایک قابل و ماہر اور شریف و دیانتدار وکیل کے طور پر قبول کیا ہے!" اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قائداعظم یقیناً ایک نہایت قابل و ماہر وکیل بھی تھے اور اُن کی دیانت اور امانت پر بھی کوئی حرف اُنکا بدترین دشمن بھی نہیں رکھ سکا۔ اِس کے باوجود نہ وہ واقعتہً 'مذہبی' انسان تھے نہ ہی انہوں نے کبھی اپنے آپ کو تکلفاً یا تصنعاً اِس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

رہے وہ علماء و مشائخ جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تو خواہ وہ اپنے اپنے مقام پر کسی بھی مرتبے اور حیثیت کے مالک رہے ہوں واقعہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان کی قیادت کے ضمن میں اُن کا مقام اوّلین صف میں نہیں بلکہ ثانوی درجے میں تھا۔ اور اُن کی اصل حیثیت 'قائدین' کی نہیں بلکہ 'معاونین' کی تھی!!!

بہرحال زیرِ بحث سوال کے اس منفی جواب کے بعد آیئے کہ اِس کا مثبت جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں:

ہمارے نزدیک اِس ضمن میں پوری حقیقت کی جامع تعبیر نہ 'معاشی' کے لفظ سے ہو سکتی ہے نہ 'سیاسی' سے، بلکہ اس کی صحیح اور جامع تعبیر کے لیے موزوں ترین لفظ وہی ہے جو پیر سید جماعت علی شاہؒ کے محولہ بالا قول میں استعمال ہوا ہے یعنی 'قومی'!

تحریک پاکستان اصلاً ایک قومی تحریک تھی اور اُس کا اصل جذبۂ محرکہ ایک چھوٹی قوم کا یہ خوف اور خدشہ تھا کہ اُس سے کئی گنا زیادہ بڑی قوم اُس کے ساتھ برابری اور انصاف کا معاملہ نہیں کرے گی بلکہ سیاسی اعتبار سے اُسے 'محکوم' بنانے کی کوشش کرے گی، معاشی سطح پر اُس کا استحصال کرے گی اور سماجی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے اُس کے تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور اسی پر بس نہیں کرے گی بلکہ ہر ممکنہ ذریعے سے اپنی گذشتہ محکومی کا بدلہ لینے اور حساب چکانے کی کوشش

کرے گی یعنی اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لے گی!۔ اور چونکہ یہ خوف' اور اندیشہ' نہ فرضی تھا نہ خیالی وہمی بلکہ حقیقی اور واقعی تھا جس کا ادراک و احساس مسلمانانِ ہند کے ہر طبقے اور ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہو رہا تھا لہٰذا اس تحریک نے جنگل کی آگ کی طرح وسعت اختیار کر لی اور اپنے جداگانہ تشخص کی ضمانت اور اپنے سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت کے لیے برصغیر کی پوری مسلمان قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی!۔ اور اس نعرے سے برصغیر کا طول و عرض گونج اٹھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!"

گویا تحریک پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ نہ مذہبی تھا۔ نہ محدود معنی میں معاشی یا سیاسی بلکہ وہ ایک قومی تھا جس نے جملہ تہذیبی و ثقافتی، سماجی و معاشرتی اور سیاسی تحرکات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا!!!

مسئلہ زیر بحث کی تیسری اور سب سے گہری سطح کا تعین اس سوال کی صورت میں ہوتا ہے کہ "اُس چھوٹی قوم کی قومیت کی بنیاد کیا تھی؟" جس کے جواب میں ہم لامحالہ وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے' اس لیے کہ یہاں پھر ایک ناقابل تردید حقیقت کا سامنا ہے اور وہ یہ کہ برصغیر کے مسلمان نہ کسی نسل کی بنیاد پر ایک قوم تھے' نہ زبان کی بنیاد پر' پھر نہ اُن کا لباس ایک تھا نہ اکل و شرب کے ذوق اور طور طریقے ایک تھے' بلکہ اُن کو ایک قوم بنانے والی کوئی قدر مشترک تھی تو صرف ایک یعنی مذہب! یہی وجہ ہے کہ اگرچہ تحریک مسلم لیگ اصلاً ایک مذہبی تحریک نہ تھی' نہ ہی اس کی اصل قیادت مذہبی لوگوں پر مشتمل تھی لیکن اُسے مسلمانانِ ہند میں ایک قومی وحدت کے شعور کو بیدار اور اُجاگر کرنے کے لیے سب سے زیادہ انحصار مذہبی جذبے پر کرنا پڑا اور برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے ع "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر" کے مصداق مذہبی نعرہ لگانا پڑا یعنی: "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!"

ہمیں اس بحث میں جانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اس نعرے میں وہ قیادت مخلص تھی یا غیر مخلص' اس لیے بھی کہ نیتوں کا حال صرف اللہ کے علم میں ہے اور ہمیں لوگوں کی نیتوں کو زیر بحث لائے بغیر ساری گفتگو حقائق و واقعات ہی کے حوالے سے کرنی چاہیئے' اور اس لیے بھی کہ کسی عوامی تحریک کے ضمن میں اصل فیصلہ کسی خاص یا چند اشخاص کے خیالات و نظریات کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس اساس پر ہوتا ہے کہ اُس میں عوام نے شمولیت کس بنا پر اور کس تصور کے تحت کی!

بنا بریں۔ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور کسی شبہ کی گنجائش نہیں

ہے کہ پاکستان کی اصل اساس سوائے دین و مذہب کے اور کوئی نہیں ہے'۔
اور پاکستان کی واحد جڑ بنیاد صرف اور صرف اسلام ہے! اور جس طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ جب اُن سے نام دریافت کیا جاتا تھا تو اولاً صرف ایک لفظی جواب دیتے "سلمان!" اور اگر عرب کی روایت کے مطابق مزید پوچھا جاتا تھا کہ "سلمان ابن"۔۔۔ تو جواباً ارشاد فرمایا کرتے تھے: سلمان ابن اسلام!" یعنی میری ولدیت اسلام ہے اسی طرح پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کی 'ولدیت' اسلام ہے!!

اسلامی انقلاب کے شیدائیوں کیلئے نادر موقع

دانا صابر نظامی کی انقلاب انگیز کتب کے پہلے ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ تھوڑی ہی مدت میں فروخت ہو چکے ہیں۔ اُنکی کتابوں کو اب ادارہ غوثیہ کارپوریشن لمیٹڈ لاہور نے دیدہ زیب کاغذ پر اضافہ و ترمیم کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ مکتبہ تعمیر انسانیت۔ اسلامی اکادمی اور ترجمان القرآن اردو بازار لاہور سے بھی دستیاب ہیں۔ ادارہ غوثیہ کارپوریشن سے بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔ آج ہی آرڈر بک کرائیے۔ حکم کی فوری تعمیل ہوگی۔

کتب کی تفصیل

۱	اسلامی انقلاب	-/۲۷	۴	اسلام اور سرمایہ داری میں جنگ	-/۲۷
۲	اسلام اور شرک	-/۲۲	۵	اسلام اور فرقہ پرستی	-/۱۲
۳	ظالم سرمایہ دار اور اسلام	-/۱۶	۶	بشریتِ انبیاءؑ	-/۱۰

غوثیہ کارپوریشن لمیٹڈ، قذافی مارکیٹ اردو بازار، لاہور

باب سوم

استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بُنیاد

تحریکِ پاکستان کے محرکات و عوامل، قیامِ پاکستان کے اسباب و وجوہات اور پاکستان کی اصل جڑ بنیاد کا مسئلہ فی نفسہٖ نہایت اہم ہے اور پاکستان کے کُل زوال و اضمحلال اور انتشارِ فکر و عمل کا اصل سبب یہی ہے کہ قومی سطح پر یہ بنیادی مسئلہ ہی متنازعہ اور مختلف فیہ ہو گیا ہے۔ تاہم چلیئے، تھوڑی دیر کے لیے فرض کیے لیتے ہیں کہ اصل اہمیت اس کی نہیں اِس لیے کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے اور ماضی تاریخ کے دھندلکوں میں غائب ہو چکا ہے اور ہمیں ماضی کے معاملے کو مستقبل کے مؤرخ کے حوالے کر کے اپنی ساری توجہات کو حال کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر پر مرکوز کر دینا چاہیئے!

اِس صورت میں بھی ہمارے غور و فکر کا اصل مرکز و محور یہ سوال ہو گا کہ پاکستان کے استحکام کے لیے حقیقتہً اور واقعتہً ٹھوس بنیاد کون سی ہے جسے مضبوط کرنے سے پاکستان مستحکم ہو جائے اور اپنے وجود اور سالمیت کے خلاف جملہ داخلی اور خارجی حملوں کے مقابلے میں اپنا مؤثر دفاع کر سکے! یہ سوال ظاہر ہے کہ، صرف دینی اور مذہبی نقطہ نگاہ ہی سے اہم نہیں ہے بلکہ خالص مادّی اور دنیوی اعتبار سے بھی نہایت اہم ہے۔ اس لیے کہ یہ ہمارا وطن ہے اور نہ صرف یہ کہ اس وقت ہم اس میں آباد ہیں بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کا مستقبل بھی اسی سے وابستہ ہے۔ یہ باعزت ہے تو ہم بھی باعزت ہیں اور خدانخواستہ یہ ذلیل ہو جائے تو اصل ذلت ہماری ہو گی۔ یہ آزاد ہے تو ہم آزاد ہیں، یہ غلام ہو گیا تو اصل غلام ہم ہوں گے۔ یہ خوشحال ہو گا تو ہم خوشحال ہوں گے اور اس پر تنگی آئی تو اُس تنگی کا شکار ہم ہوں گے۔ گویا یہ کشتی تیرتی ہے تو ہم تیرتے ہیں اور یہ ڈوب گئی تو ہم غرق ہو جائیں گے! لہٰذا ہر پاکستانی کے لیے لازم ہے کہ وہ پاکستان کے باعزت

بقاء اور اس کے استحکام کے مسئلے پر پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار کرے!

تو آیئے کہ سب سے پہلے اس بات پر غور کریں کہ بالعموم ملکوں کو کن کن جہتوں سے تقویت ملتی ہے اور کن کن عوامل کی بنا پر استحکام حاصل ہوتا ہے اور ان میں سے کون کون سے عوامل ہمیں پاکستان کے استحکام کے لیے دستیاب ہیں جنہیں مزید تقویت دے کر ہم پاکستان کو مستحکم کر سکتے ہیں۔

۱۔ تاریخی عامل

ان میں سے اوّلین عامل کو 'تاریخی عامل' (HISTORICAL FACTOR) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی ملک عرصۂ دراز سے ایک ہی نام اور ایک ہی سے حدود اربعہ کے ساتھ قائم ہو تو اُس نام اور اُن حدود کو ایک گونہ 'تاریخی تقدّس' (HISTORICAL SANCTITY) حاصل ہو جاتا ہے اور یہ اُس کی تقویت کا موجب اور اُس کے اِستحکام کا سبب بن جاتا ہے، اور اگر کبھی اِس پر بحیثیّت مجموعی یا اُس کے کسی علاقے پر جزوی طور پر کوئی دوسرا ملک قبضہ کر لیتا ہے تب بھی نہ اُس کا نام بدلتا ہے نہ دنیا یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ علاقہ اب اُس ملک کا حصّہ نہیں رہا بلکہ قابض ملک کا جزو بن گیا ہے ـــــ مثال کے طور پر سب سے دنیا کی تاریخ انسان کے علم میں ہے اُسی وقت سے چین نامی مُلک بھی دنیا میں موجود ہے اور اُس کا نام بھی ہمیشہ سے یہی چلا آ رہا ہے اور اُس کی حدود بھی ہمیشہ تقریباً یہی رہی ہیں ـــــ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگرچہ جاپان نے چین کے بہت بڑے رقبے پر طویل عرصے تک قبضہ کیے رکھا لیکن یہ نہیں ہُوا کہ وہ علاقہ 'چین' نہ رہا ہو بلکہ 'جاپان' بن گیا ہو۔ بلکہ چین چین ہی رہا اور جاپان جاپان رہا اور کہنے میں یہی آتا رہا کہ چین کے اِتنے رقبے پر جاپان قابض ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تاریخی عامل اور یہ تاریخی تقدّس پاکستان کو حاصل نہیں ہے ـ اور اِس نام اور اِن حدُود کے ساتھ تاریخِ انسانی میں کبھی کوئی مُلک موجود نہیں رہا۔ بلکہ پاکستان کا تو لفظ آج سے پچاس سال قبل تک دنیا کی کسی لُغت میں موجود ہی نہیں

تھا۔ ذرا غور کیا جائے تو یہ اسی کا مظہر تھا کہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے پاکستان کے نام کی قیمت ٹکا بھر بھی نہ سمجھی اور مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوتے ہی اس نام کے لیبل کو اپنی پیشانی سے اُتار کر خلیج بنگال میں غرق کر دیا! —— ورنہ غور کا مقام ہے کہ کیا اِس وقت دنیا میں دو جرمنی، دو یمن اور دو کوریا موجود نہیں ہیں؟ اور کیا ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے نام کو چھوڑنا گوارا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں! یہ اس لیے کہ ان ناموں کی تاریخی حیثیت ہے جس کی بنا پر انہیں ایک شہرت اور نیک نامی (GOOD WILL) حاصل ہے جسے کوئی بھی ہاتھ سے دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ جبکہ 'پاکستان' ایک جدید اور 'حادث' نام ہے جس کی کوئی خاص قدر و قیمت ابھی قائم نہیں ہوئی!

واقعہ یہ ہے کہ راقم کے نزدیک اگر مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو جاتا لیکن اپنے نام کو برقرار رکھتا تو صدمہ تو اِس صورت میں بھی ہوتا لیکن اکہرا —— اور جب اُس نے اپنا نام تک بدل ڈالا تو یہ دوہرے صدمے والی بات ہوئی۔ اِس لیے کہ اِس طرح ہمارے بنگالی بھائیوں نے نہ صرف خود اپنی پینسٹھ سالہ تاریخ سے اعلانِ برأت کیا بلکہ پورے برِّصغیر پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ کی توہین کی جس کی مشترکہ متحدہ جدّوجہد سے پاکستان قائم ہُوا تھا! یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اِس پورے معاملے میں اصل مورد الزام ہمارے بنگالی بھائی ہیں یا ہم یا پوری سابقہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان! —— اسی طرح ؎

"اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے"

کے مصداق یہ بھی لازمی نہیں کہ مشرقی پاکستان کی یہ قلبِ ماہیت مستقل اور دائمی ہو۔ اِس ضمن میں بنگلہ دیش کے قیام سے لے کر اب تک بھارت کا جو سلوک اُس کے ساتھ رہا ہے اُس کے ردِّعمل کے طور پر الحمدللہ وہاں پاکستانیت کا اِحیاء اس حد تک ہو چکا ہے کہ مولوی فرید احمد مرحوم کے صاحبزادے کا یہ بیان سامنے آچکا ہے کہ ہم وہاں

آئندہ الیکشن 'مشرقی پاکستان' کے نام پر لڑیں گے۔

بہرحال یہ رنج اور صدمے والی بات بھی اپنی جگہ اور اسی طرح آئندہ کے امکانات سے بھی قطع نظر اس وقت کی بحث کے اعتبار سے اصل اہمیت اس حقیقت کی ہے کہ پاکستان کی تقویت کے لیے 'تاریخی تقدس' کی قسم کا کوئی عامل موجود نہیں ہے! اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا وہ قول بیک وقت دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی جو حال ہی میں پاکستان کے بزرگ صحافی میاں محمد شفیع نے ایک روزنامے کے کالموں میں نقل کیا ہے یعنی یہ کہ "پاکستان کے معاملے کو ہندوستان پر قیاس نہ کیا جائے، ہندوستان ایک 'ملک' ہے اس کے حالات کتنے بھی خراب ہو جائیں بہرحال یہ موجود رہے گا جبکہ پاکستان ایک 'تجربہ' ہے جو اگر ناکام ہو گیا تو پاکستان کا نام و نشان مٹ جائے گا!" ـــــ میرے نزدیک اگر یہ روایت درست ہے تو مولانا مرحوم نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جس فرق کی نشاندہی کی ہے وہ اسی 'تاریخی عامل' پر مبنی ہے!!

۲ - جغرافیائی عامل

کسی ملک کو تقویت دینے والا دوسرا عامل جغرافیائی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اگر کسی ملک کی سرحدیں فطری جغرافیائی حدود (NATURAL GEOGRAPHICAL BOUNDRIES) کی صورت میں ہوں تو اس سے بھی اُس ملک کو ایک گونہ حفاظت حاصل ہوتی ہے جو کی تقویت کی موجب اور اُس کے دفاع میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ کلامِ اقبال کے پہلے اُردو مجموعے کی پہلی نظم کے پہلے شعر میں یہ حقیقت بڑی خوبصورتی کے ساتھ سامنے آتی ہے

یعنی ؎ "اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چُومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں"

چنانچہ واقعہ ہے کہ موجودہ ساری سائنسی اور تکنیکی ترقی کے باوجود کوہِ ہمالیہ کی حیثیت بھارت کے شمال میں ایک فصیل کی سی ہے اور اگرچہ تقسیمِ ہند کے بعد ہمالیہ

کے انتہائی مشرقی حصّے میں چین اور بھارت کے مابین ایک خونریز جھڑپ ہو چکی ہے جو نتائج کے اعتبار سے بھارت کے لیے نہایت ذلّت آمیز اور رُسوا کن ثابت ہوئی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کی پوری تاریخ ایسے کسی واقعے سے بالکل خالی ہے۔ اور اب بھی بھارت کو اِس جانب سے اندیشہ بہت کم ہے۔

اِسی طرح ۱۹۶۵ء کی جنگ کے ضمن میں ہمیں خود یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ کس طرح ایک وقتی سے جوش اور جذبے کے تحت وجود میں آنے والی بی آر بی کینال بھارت کے بھرپور حملے کے مقابلے میں لاہور کی حفاظت کا ذریعہ بن گئی تھی۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو ۱۹۴۷ء میں قائم ہونے والا اصل پاکستان تو واقعتہً تاریخ کا ایک انوکھا تجربہ نظر آتا ہے، اِس لیے کہ وہ ایسے دو خطّوں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع تھے اور اُن کے درمیان سمندر نہیں تھا بلکہ وہ ملک تھا جس کی مستقل حیثیت دشمن کے علاقے (HOSTILE TERRITORY) کی تھی۔ اور غریب مشرقی پاکستان تو تین اطراف سے اُس دشمن کے علاقے میں اِس طرح گھرا ہُوا تھا کہ کسی جانب بھی کسی فطری و طبعی آڑ (NATURAL BARRIER) کا وجود نہ تھا۔

مشرقی پاکستان کے مسئلے کو علیحدہ رکھتے ہوئے، موجودہ پاکستان کا حال بھی یہ ہے کہ اِسے کسی طبعی اور فطری سرحدوں کا تحفظ کسی درجے میں حاصل ہے بھی تو وہ شمال، جنوب اور مغرب میں ہے۔ یعنی شمال میں وہی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ قراقرم، جنوب میں سمندر اور مغرب میں کوہِ سلیمان کا پہاڑی سلسلہ، جہاں تک اس کی طویل ترین مشرقی سرحد کا تعلق ہے، جدھر سے اسے سب سے زیادہ تحفظ کی ضرورت ہے اُدھر کسی فطری و طبعی سرحد کا نشان تک موجود نہیں، چنانچہ پنجاب کا میدان اِس طرح کاٹا گیا ہے جیسے کیک کاٹا جاتا ہے، اور اگر خاردار تاروں کی کوئی باڑ موجود نہ ہو تو معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ کہاں ایک ملک ختم ہو گیا اور دوسرا شروع ہو گیا! رہا سابق ریاست بہاولپور اور پھر سندھ کے ریگزار اور صحرا کا تعلق تو اُس کے ٹیلے

تو خود ہی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہتے ہیں، وہ کیا نشان بنیں گے اور کیا حفاظت کریں گے !! ع "او خویشتن گم است کرا رہبری کند !"

الغرض ! جغرافیہ بھی ہمارا پشت پناہ نہیں ہے بلکہ ہمارے خلاف ہے !

۳- اِنسانی جذبہ

ملکوں کو مستحکم کرنے والے تیسرے عامل کو 'انسانی جذبہ' کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کسی ملک یا خطہ ارضی کے رہنے والے انسانوں میں کوئی حقیقی اور واقعی جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ تاریخ کو بھی شکست دے سکتا ہے اور جغرافیے سے بھی لڑ سکتا ہے، اِس لیے کہ انسان واقعتہً اشرف المخلوقات ہے اور قدرت نے اِس میں بے پناہ قوتیں اور توانائیاں ودیعت کر رکھی ہیں ! اور واقعہ یہ ہے جب کسی قوم اور بالخصوص اُس کے جوانوں میں کوئی جذبہ حقیقتہً اور واقعتہً پیدا ہو جائے تو اُس کا رُخ سوائے مشیّتِ ایزدی اور قدرتِ خداوندی کے دنیا کی کوئی اور طاقت نہیں پھیر سکتی ـــــ بقول اقبال ؎

"عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں !"

اب اگر ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو انسانی جذبے کی دو ہی قسمیں نظر آئیں گی : ایک ، قوم پرستانہ جذبہ اور دوسرے ، مذہبی جذبہ ـــــ ان میں سے بھی اگرچہ تاریخ انسانی کے عظیم ترین معجزے تو مذہبی جذبے ہی کے تحت رونما ہوئے ہیں تاہم کچھ اِس بنا پر کہ موجودہ دنیا میں یہ جذبہ بالعموم کمزور ہی نہیں معدوم کے درجے میں آگیا ہے ـــــ اور کچھ موجودہ بحث کی منطقی ترتیب کے تقاضے کے طور پر پہلے ہم 'قوم پرستانہ جذبہ' کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیا اس کی کوئی قسم بالنوع ہمارے پاس بالفعل موجود یا ہمارے لیے ممکن الحصول ہے یا نہیں ؟

قوم پرستی کی اقسام

۱- نسلی قوم پرستی

قوم پرستی (NATIONALISM) کی اقسام کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے یہ حیران کُن حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ دنیا میں تمام تر علمی و سائنسی ترقی اور ذہنی و فکری ترقع کے باوجود نسل پرستانہ قومیت (RACIAL NATIONALISM) کا جذبہ سب سے زیادہ طاقتور اور مؤثر ہے۔ عہدِ حاضر میں اس کی دو نمایاں ترین مثالیں جرمن نیشنلزم اور یہودی نسل پرستی کی صورت میں موجود ہیں۔ جرمن قوم میں اپنے بارے میں ایک اعلیٰ اور برتر نسل (A SUPERIOR RACE) ہونے کے احساس نے اتنا جذبۂ عمل اور قوتِ مقاومت پیدا کر دی ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے بیسویں صدی عیسوی کے دوران جرمنی دو بار شدید ترین تباہی سے دوچار ہُوا لیکن دونوں مرتبہ چند ہی سال کے اندر اندر پھر نہ صرف یہ کہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا بلکہ دوسری ہمعصر اقوام اور آس پاس کے ممالک کا ہر اعتبار سے ہمسر ہو گیا بلکہ بعض اعتبارات سے اُن سے بھی بازی لے گیا۔ اسی طرح یہودی قوم میں بنی اسرائیل کے 'خدا کی منتخب اور پسندیدہ قوم' (CHOSEN PEOPLE OF THE LORD) ہونے کے احساس نے مقاومت اور مدافعت کی اتنی صلاحیت اور اپنی برتری کے بالفعل اظہار (ASSERTION) کے لیے بے پناہ محنت اور جدّوجہد کا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ تاریخِ انسانی کے دوران بارہا انہیں شدید ترین جبر و تشدد (PERSECUTION) کا سامنا کرنا پڑا۔ اور بعض مواقع پر تو ان کے استیصال (ANNIHILATION) اور کلی اور مجموعی خاتمے (MASS EXTERMINATION) کی ایسی سرتوڑ کوششیں ہوئیں کہ جن کی کوئی

دوسری مثال تاریخ انسانی میں بمشکل ہی مل سکے گی۔ اِس سب کے باوجود وہ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور ع "اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے" کے مصداق اگر کسی ایک خطّے یا مُلک سے اُنہیں دیس نکالا مل جاتا ہے تو کچھ ہی عرصے کے بعد نظر آتا ہے کہ انہوں نے کسی اور ملک میں قدم جمالیے ہیں۔ چنانچہ اِس صدی کے آغاز میں علّامہ اقبال نے ان کی جس کیفیت کا مشاہدہ بچشم سر یورپ میں کیا تھا جس کی تعبیر انہوں نے ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ ع "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!" اُس کے بعد بالخصوص جرمنی میں ہٹلر کے ہاتھوں اِن کا جو حشر ہُوا اور وقتی طور پر اُنہیں جو نقصان پہنچا اُس کے چند سالوں کے اندر اندر انہوں نے بعینہٖ وہی حیثیت امریکہ میں حاصل کرلی۔ چنانچہ آج اسرائیل کی چھوٹی سی مملکت امریکہ ہی کی امداد اور سرپرستی کے بل پر نہ صرف پورے عالمِ عرب بلکہ پورے عالمِ اسلام کو ناک چنے چبوا رہی ہے ـــــ اور اِسی پر بس نہیں دُور بیٹھے پاکستان تک کو دھمکیاں دے رہی ہے۔

اِس سلسلے میں ضمنی طور پر یہ بات بھی سامنے آجائے تو اچھا ہے کہ یہ بات جو دنیا میں بالعموم کہی جاتی ہے کہ موجودہ دنیا کے دو مُلک مذہب کی بنیاد پر قائم ہوئے ہیں، ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل، تو یہ درحقیقت اسرائیل کی نسل پرستی کو چھپانے کا نہایت شاطرانہ انداز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالص مذہب کی بنیاد پر دنیا میں صرف ایک ہی ملک قائم ہُوا ہے اور وہ ہے پاکستان، اسرائیل کی اساس مذہب پر نہیں نسل پرستی پر ہے۔ اور "صیہونیت" (ZIONISM) اصلاً ایک دینی اور مذہبی تحریک نہیں بلکہ نسل پرستانہ تحریک ہے (RACIAL MOVEMENT) اور اسرائیل خالص نسل پرستانہ ملک ہے (RACIST)۔

بہرحال ہماری اس وقت کی گفتگو کے اعتبار سے اہم نکتہ یہ ہے کہ نظری طور پر نسل پرستی کی بنیاد پر بھی ایک نہایت طاقتور جذبہ وجود میں آسکتا ہے ـــــ لیکن (الحمدُ للّٰہ) پاکستان میں نسلی قومیّت کے لیے کوئی اساس موجود نہیں ہے۔ اِس لیے کہ برِّصغیر پاک و ہند نسلی اعتبار سے غالباً پوری دنیا میں سب سے بڑی کھچڑی (بلکہ حلیم!) کی حیثیت

رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اُسی کا ایک خلاصہ اِس وقت پاکستان میں موجود ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دڑاوڑی لوگ بھی موجود ہیں (جیسے بلوچستان کے براہوی قبائل) اور آریائی نسل سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں، اِسی طرح منگول بھی ہیں اور سامی النسل بھی، بلوچ بھی ہیں اور افغان بھی، حتّٰی کہ شمالی علاقہ جات میں نیگرو بھی ہیں اور کیلٹی بھی! الغرض یہاں کسی ایک نسل کے لوگ ایسی غالب اکثریت میں موجود نہیں ہیں کہ نسلی قوم پرستی کی بنیاد پر ملک کے استحکام کی توقع کی جا سکے!

۲- لسانی قوم پرستی

نسلی قوم پرستی کے بعد موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور قومی جذبہ (POTENT NATIONALISM) لسانی قوم پرستی "(LINGUISTIC NATIONALISM) کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کی بھی دو مثالیں قابلِ توجہ ہیں: ایک عرب نیشنلزم اور دوسرے بنگلہ نیشنلزم!

عرب نیشنلزم جو ماضی قریب میں عالمِ عرب میں ایک زبردست قوت کی حیثیت سے موجود رہا ہے اصلاً ایک لسانی نیشنلزم ہے۔ اِس لیے کہ اس کی اساس نہ مذہب پر ہے نہ نسل پر۔ بلکہ صرف اور صرف زبان پر ہے۔ چنانچہ اس کے حلقہ بگوش اور علمبردار صرف مسلمان ہی نہیں رہے ہیں بلکہ دانشوروں کی سطح پر اس میں زیادہ بھاری پلڑا عیسائیوں کا رہا ہے ـــــ حتّٰی کہ یہودی بھی اس میں شریک رہے ہیں، پھر اس میں نسل کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہے اِس لیے کہ شمالی افریقہ کے باشندوں میں جہاں عرب آبادکاروں کی اولاد شامل ہے وہاں قدیم قبطی اور بربر نسل کے لوگ بھی موجود ہیں لیکن اس سب کے باوجود محض زبان کے اشتراک نے اِن سب میں مشترک قومیت کا احساس پیدا کیا اور خواہ اُس کے اساسی فلسفے سے ہمیں کتنا ہی اختلاف ہو بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عالمِ عرب نے یورپی استعمار کے خلاف جو جدّوجہد کی اور جس کے بل پر اِس استعمار کا جُوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا اُس کی اصل اساس اِسی

لسانی قوم پرستانہ جذبہ پر تھی!

اِسی طرح پاکستان کے دولخت ہونے میں جہاں منفی طور پر اوّلاً بے مقصدیت اور بے یقینی کے خلاء اور بعد ازاں مارشل لاء کے ردِّ عمل کو دخل حاصل ہے وہاں مثبت طور پر جو ہتھیار سب سے زیادہ کارگر اور جو دار سب سے بڑھ کر کاری ثابت ہُوا وہ بنگلہ نیشنلزم کا تھا جس کی اساس بنگلہ زبان پر قائم کی گئی تھی!

یاد ہوگا کہ حصولِ پاکستان کی تحریک کے دوران نو چونکہ مقابلہ ہندو قوم اور ہندی زبان سے تھا لہٰذا مسلم قومیت اور اردو زبان تقریباً لازم و ملزوم بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تقریباً مترادف اور ہم معنی ہو گئے تھے لیکن قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان اُردو کے مدِّ مقابل کی حیثیت سے سامنے آگئی تھی۔ اور خود قائدِ اعظم کی زندگی کے دوران اِس مسئلے نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ اُنہیں اپنی تمامتر علالت اور نقاہت کے باوجود مشرقی پاکستان کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔ اِسی زمانے کا واقعہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی رح کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے نہایت توہین آمیز رویّہ محض اس بات پر اختیار کیا تھا کہ انہوں نے خالص علمی انداز میں وہاں یہ فرما دیا تھا کہ کچھ عرصہ قبل بنگلہ زبان کا رسم الخط (SCRIPT) بھی وہی تھا جو عربی، فارسی، اُردو، حتیٰ کہ سندھی، بلوچی اور پشتو کا ہے اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ دوبارہ بنگلہ زبان کا رسم الخط اُردو والا ہی اختیار کر لیا جائے تو لسانی بُعد و فصل میں کمی آجائے گی جس سے قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا!— بہرحال پاکستان کی زندگی کے پہلے پچیس ۲۵ سالوں کے دوران (واضح رہے کہ اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک شمسی حساب سے تقریباً سوا چوبیس سال بنتے ہیں۔ لیکن قمری حساب سے پچیس سال سے بھی کسی قدر زائد!) جہاں ایک جانب بے یقینی اور بے مقصدیت کا خلا مہیب سے مہیب تر ہوتا چلا گیا اور قومی و ملّی سطح پر ضعف بڑھتا چلا گیا وہاں مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان، بنگلہ ادب، بنگلہ تہذیب اور بنگلہ ثقافت کے حوالے سے بنگلہ نیشنلزم قدم جماتا چلا گیا— اور بالآخر اسی کے

منطقی نتیجے کے طور پر "بنگلہ دیش" وجود میں آگیا۔ اور مشرقی پاکستان کا نام بھی دنیا کے نقشے سے غائب ہوگیا!

ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ زبان کا اشتراک لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان میں یگانگت پیدا کرنے میں نسلی اشتراک سے بھی زیادہ مؤثر اور سریع الاثر ہے۔ اِس لیے کہ نسلی اشتراک کا تعلق اصلاً ماضی اور اُس کی روایات سے ہوتا ہے جبکہ لسانی اشتراک فی الفور محسوس و مشہود ہوتا ہے اور اپنی مادری زبان میں انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار جس بے تکلفی سے اور جس بھرپور انداز میں کرسکتا ہے کسی دوسری زبان کو خواہ وہ کتنا ہی سیکھ لے اور اُس میں کتنی ہی مہارت حاصل کرلے اُس میں جذبات کے اظہار کی وہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ بنا بریں اشتراکِ لسانی اجتماعیات انسانیہ میں 'عصبیّت' پیدا کرنے میں بہت دخیل اور مؤثر ہے۔

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو اگرچہ باقی ماندہ پاکستان میں وہ واحد زبان جو اِس کے ہر حصّے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے صرف اور صرف اُردو ہے، تاہم اِس کا عمل دخل اتنا بہر حال نہیں ہے کہ اُسے ایک لسانی قومیّت کی بنیاد بنایا جاسکے۔ اور بنگلہ زبان کا مسئلہ ختم ہوجانے کے بعد موجودہ پاکستان میں کم از کم ایک زبان ایسی موجود ہے جو کسی بھی طور سے اُردو کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں! ہماری مُراد سندھی زبان سے ہے۔ جس کی اساس پر 'سندھی نیشنلزم' ہو بہو 'بنگلہ نیشنلزم' کے خطوط پر پروان چڑھ رہا ہے — بلکہ واقعتاً ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرچکا ہے — حتّٰی کہ 'بچے کھچے پاکستان' کو سب سے بڑا داخلی خطرہ اِسی سے لاحق ہے۔

یہ اِسی کا مظہر تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے تقریباً فوراً بعد لسانی فسادات کا لاوا سندھ میں پھٹ پڑا تھا جس سے مغربی پاکستان کی سالمیت کی چُولیں ہل کر رہ گئی تھیں — اور سقوطِ مشرقی پاکستان پر بھارت کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے

جہاں یہ الفاظ کہے تھے کہ "ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے لیا ہے!"
(WE HAVE AVENGED ONE THOUSAND YEAR'S DEFEAT) جس سے
پنڈت موتی لال نہرو ایسے بظاہر وسیع المشرب انسان کی پوتی اور پنڈت جواہر لال نہرو ایسے مذہبیت سے دُور اور سوشلزم کے پرستار کی بیٹی کی بھی خالص 'ہندوانہ ذہنیت' کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ وہاں ساتھ ہی اپنی قوم سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ: میں عنقریب ایک بہت بڑی خوش خبری اور سنانے والی ہوں!" جس سے یہ بات الم نشرح ہوگئی تھی کہ بقیہ پاکستان کی سالمیت بھی ہندو ذہن اور مزاج کے لیے کس درجہ ناقابلِ برداشت شے ہے! اِس لیے کہ اُس کے اِس وعدے کا مصداق خارجی ظاہر ہے کہ سندھ کے لِسانی فسادات کے سِوا اور کوئی چیز قرار نہیں دی جاسکتی!—

قِصّہ مختصر یہ کہ ہمارے پاس آلِ پاکستان اساس پر کسی لِسانی قومیّت سے پیدا شدہ جذبۂ عمل تو درکنار، 'تا حال' قومی زبان' کے مسئلے کا حل بھی موجود نہیں ہے۔

۳- وطنی قومیّت

وطن کی اساس پر قومیت کی تشکیل کا تصوّر زیادہ پُرانا نہیں ہے اور اِسے عہدِ جدید کی پیداوار قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ تاہم اِس وقت عالمی سطح پر کم از کم نظری اور دستوری و قانونی اعتبار سے سب سے زیادہ چرچا اور سب سے بڑھ کر رواج اِسی کا ہے۔

منطقی اعتبار سے یہ بات بڑی وزنی (SOUND) نظر آتی ہے کہ اگر کسی مُلک کے رہنے والوں میں اپنے وطن سے قلبی محبت کا جذبہ پیدا ہوجائے تو یہ اُن کے احساسات و جذبات میں یک رنگی و ہم آہنگی اور فکر و عمل میں اتحاد اور یک جہتی کی بُنیاد بن جائے گا اور اُنہیں ایک "بنیانِ مرصوص" کی صورت عطا کر دے گا— اور اِس کے زیرِ اثر رنگ و نسل، عقیدہ و مذہب اور زبان و ثقافت کا فرق و امتیاز جو ملکوں اور قوموں

کی کمزوری کا باعث بنتا ہے اگر بالکل ختم نہیں ہو گا تو کم از کم غیر اہم ضرور ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ حاضر میں قومیت کے تعین کے ضمن میں وطن ہی کو تقریباً متفقہ طور پر اساس تسلیم کر لیا گیا ہے (چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ ایک موقع پر مولانا حسین احمد مدنی رح کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ "آج کل قومیں وطن کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں" جس پر نہایت سخت اور تیز و تند تنقید کی تھی مفکر و مصورِ پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے، جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا!) تاہم بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تا حال 'وطنی قومیت' کی جڑیں لوگوں کے احساسات و جذبات میں گہری اُتری ہوئی نہیں ہیں اور جذبات کی دنیا میں اصل راج رنگ و نسل، عقیدہ و مذہب اور زبان و ثقافت ہی کا ہے، اور بالفعل 'وطنی قومیت' صرف مُلکی دستور میں شہریت (CITIZENSHIP) کی اساس اور پاسپورٹوں پر قومیت (NATIONALITY) کے اندراج کے طور پر کام آتی ہے اور اس نے کسی مؤثر 'قوم پرستی' (NATIONALISM) کی صورت کہیں بھی اختیار نہیں کی۔

اس کے باوجود چونکہ پاکستان میں کسی قوم پرستانہ جذبہ کی پیدائش اور نشو و نما کے لیے نہ اشتراکِ نسل کی بنیاد موجود ہے نہ اشتراکِ زبان کی، لہٰذا اس کے ضمن میں کم از کم نظری طور پر کسی قوم پرستانہ جذبے کے لیے واحد دستیاب اساس (THE ONLY AVAILABLE BASIS) یہی رہ جاتی ہے اور غالباً اسی درجہ بدرجہ نفی کے عمل (PROCESS OF ELIMINATION) کا نتیجہ تھا کہ بانی و مؤسسِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران یہ جملہ کہہ دیا تھا کہ: "عنقریب پاکستان میں نہ مسلمان مسلمان رہیں گے نہ ہندو ہندو رہیں گے، مذہبی اعتبار سے نہیں، اس لیے کہ مذہب تو اشخاص کا انفرادی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی مفہوم کے اعتبار سے!" ــــ قائدِ اعظم مرحوم کے ان الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ ــــ اور آیا ان الفاظ کو اُن کے سابقہ بیانات اور اعلانات کی نفی اور اپنے سابقہ

مُوقف سے انحراف کا مظہر قرار دیا جائے یا اُن کے اعصاب پر اُس وقت کے حالات کی پیچیدگیوں اور سنگینیوں سے پیدا شدہ شدید دباؤ کا اثر سمجھا جائے؟ جیسا کہ غلام احمد پرویز نے بالفعل کیا ہے! اِس وقت ہمیں اِس سے بحث نہیں ہے اور اگرچہ اِس کے ضمن میں راقم الحروف کی ایک سوچی سمجھی رائے ہے جسے اِن شاء اللہ بعد میں بیان بھی کیا جائے گا تاہم موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے فی الوقت عرض یہ کرنا ہے کہ خواہ کوئی شخص اِس نتیجے پر، کہ پاکستان کے مسائل کا حل ایک وطنی نیشنلزم میں ہے، مجبوراً متذکرہ بالا 'PROCESS OF ELIMINATION' سے پہنچا ہو خواہ وہ مثبت طور پر اِسی نظریے کا ذہناً و قلباً قائل ہو حقیقتِ واقعی یہ ہے کہ 'پاکستانی نیشنلزم' نام کی کوئی شے نہ تا حال وجود میں آئی ہے نہ تا قیامت آسکتی ہے! — !!

پہلی وجہ: دو قومی نظریہ

اِس کی اوّلین اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ پاکستان دو قومی نظریہ کی اساس پر وجود میں آیا تھا جو وطنی قومیت کے نظریئے کی کامل نفی کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ کوئی مُلک قائم تو ہو کسی نظریے کی کامل نفی کی اساس پر اور پھر اُس کے اِستحکام کے لیے وہی نظریہ جڑ بنیاد کا کام دے سکے!

یاد کیجیے! کہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مابین اختلاف و نزاع کی اصل بنیاد کیا تھی؟ کانگریس کے نزدیک مذہب و ملّت کا معاملہ علیٰحدہ تھا اور قومیت کا علیٰحدہ، چنانچہ ہندوستان میں مذاہب بہت سے تھے لیکن اُن سب کے پیروؤں پر مشتمل قوم ایک ہی تھی یعنی انڈین نیشن یا ہندی قوم، جبکہ مسلم لیگ کا مُوقف یہ تھا کہ یہ صورت دوسرے جملہ مذاہب کے پیروؤں کے نزدیک قابلِ قبول ہو تو ہو کم از کم مسلمانانِ ہند کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں، اِس لیے کہ اُن کی قومیت کی اساس مذہب پر ہے، لہٰذا وہ ایک علیٰحدہ قوم ہیں اور اپنے جُداگانہ قومی تشخص کے بقاء کی ضمانت کے طور پر علیٰحدہ ملک کے حق دار ہیں!

اِس موضوع پر خود قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بے شمار بیانات اور اعلانات مشہور و معروف ہیں جن کا دوہرانا محض تحصیلِ حاصل کا مصداق اور وقت اور قلم و قرطاس کے لاحاصل صَرف کا باعث ہوگا۔ البتہ اصولی اور اساسی اعتبار سے 'وطنی قومیّت' کے نظریئے پر جو کاری ضرب مفکّر و مصوّرِ پاکستان علّامہ محمد اقبال نے لگائی تھی وہ یقیناً اِس قابل ہے کہ اُسے ذہنوں میں تازہ کیا جائے۔ اِس لیے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے صرف تہذیبی، تمدّنی اور ثقافتی شواہد ہی پیش نہیں کیے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک ضربِ ابراہیمی سے اِس باطل نظریئے کے بُت ہی کو پاش پاش کر دیا تھا کہ ملکی سرحدیں مستقل قومیّتوں کی تشکیل کی بنیاد بن سکتی ہیں اور انسان محض زمینی تعلّق کی بنا پر ایک دوسرے سے کٹ سکتا ہے: چنانچہ "وطنیّت (یعنی وطن بحیثیّت ایک سیاسی تصوّر کے)" کے عنوان سے فرماتے ہیں ؎

" اِس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بِنا کی روشِ لطف و سِتم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور —!
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!
یہ بُت کہ ترا شیدۂ تہذیبِ نوی ہے!
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے!
بازُو ترا توحید کی قوّت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفوی! خاک میں اِس بُت کو مِلا دے!"

ذرا الفاظ کی گہرائی میں اُتر کر مفکّر و مصوّرِ پاکستان کے اس موضوع پر احساس

کی شدت کا اندازہ لگایا جائے تو بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے کہ

" عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا!"

اِسی طرح مولانا سیّد حسین احمد مدنی رح کے متذکرہ بالا جملے، پر جو تلخ اور تیز و تُند لیکن شعریت اور فصاحت و بلاغت کی معراج کے مظہر اشعار کہے تھے علّامہ سر محمد اقبال مرحوم نے وہ یہ تھے :

" عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زِ دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست!
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر زِ مقامِ محمّدِ عربی است!
بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!"

یہ دوسری بات ہے کہ جب مولانا مدنی رح نے یہ وضاحت فرمائی کہ : اوّلاً — اُنہوں نے لفظِ قوم کا استعمال کیا تھا ملّت کا نہیں! اور ثانیاً : اُنہوں نے صرف موجودہ دور کی عام روش کا ذکر کیا تھا، نہ اُس کی وکالت کی تھی نہ ہی مسلمانوں کو اِس کے قبول کرنے کی تلقین کی تھی تو علّامہ مرحوم نے فوراً اعتراف کیا کہ اِس پر اعتراض کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے اور اپنے اشعار سے بھی رجوع کر لیا۔ اگرچہ اُن کے کلام کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ اشعار اَب بھی شائع ہو رہے ہیں! (کاش کہ اِن اشعار کے ساتھ کلامِ اقبال کے طابع و ناشر متذکرہ بالا حقائق پر مشتمل ایک ضمنی نوٹ بھی شائع کر دیا کریں)

قصّہ مختصر — وطنی قومیت کا نظریہ تحریکِ پاکستان کی نفی ہے اور اس کے فروغ سے پاکستان کی جڑیں مزید کھوکھلی تو ہو سکتی ہیں مضبوط نہیں ہو سکتیں!

دُوسری وجہ : مسلمانوں کی طبعی ساخت

دوسری نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ باعمل (PRACTISING) ہو، خواہ بے عمل (NON-PRACTISING)، بہرحال اُس کے مزاج کی ایک مستقل ساخت ہے اور اُس کی طبیعت کی ایک خاص اُفتاد ہے جس میں زمین کی پرستش اور وطن کے تقدس کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ گویا اُس کی شخصیت کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے، اُس میں "حبِ وطن" کا مادّہ تو ہو سکتا ہے "وطن پرستی" کا امکان نہیں ہے! پروفیسر مرزا محمد منوّر اِس حقیقت کو اِن خوبصورت الفاظ سے تعبیر کیا کرتے ہیں کہ ہندو کلچر زمین میں گڑا ہُوا اور زمین سے بندھا ہُوا (EARTH ROOTED AND EARTH BOUND) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں زمین "دھرتی ماتا" کی حیثیت رکھتی ہے اور "بھارت کی جے" کے نعرے سے اُن کے جذبات میں اُبھار اور احساسات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے جبکہ مسلمان کے دل میں زمین کے مقدس یا دیوتا ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے بلکہ اُس کا مزاج "آفاقی" ہے اور اُس کے جذبات میں گرمی اور احساسات میں ہلچل "اللہ اکبر" کے نعرے سے ہوتی ہے! علامہ اقبالؔ نے اپنی اُس نظم میں جس کے چند اشعار اُوپر نقل ہو چکے ہیں اِس "قیدِ زمینی" کے تصور پر بھی نہایت زوردار تیشہ چلایا ہے ؎

"ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبُوبِ الٰہیؐ
دے تُو بھی نبوّت کی صداقت کی گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے!"

برِّصغیر کے مسلمانوں کی خصُوصیت

اِس معاملے میں، واقعہ یہ ہے کہ، برِّصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو زیادہ ہی خصوصیت حاصل ہے اور ان کا مزاج کچھ زیادہ ہی 'آفاقی' ہے۔ اِس کا ایک ممکنہ سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہاں کوئی دُوسری نسلی یا لِسانی عصبیت ایسی موجود نہیں تھی جو اُنہیں ایک دوسرے سے باندھ سکتی لہٰذا اپنی شیرازہ بندی کے لیے انہیں مذہب کی قوّتِ ماسکہ (BINDING FORCE) پر دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہی انحصار کرنا پڑا اور چونکہ اسلام ایک علاقائی مذہب نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی مذہب ہے۔ لہٰذا اُن میں 'آفاقیت' دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی سرایت کر گئی! اور ع "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست!" اُن کے قلوب و اذہان میں خوب رچ بس گیا اور اُن کے قومی شعور کا جزوِ لاینفک بن گیا!

چنانچہ بیسویں صدی عیسوی میں مغربی استعمار کے ہاتھوں عالمی ملّتِ اسلامیہ کو جو چرکے لگے اور صدمے سہنے پڑے اور جن مظالم کا نشانہ بننا پڑا اُن پر سب سے زیادہ درد انگیز نالے اور رقّت آمیز مرثیے ہندوستان کے مسلمانوں نے کہے اور اور اگرچہ وہ خود تو اُن مظالم و مصائب سے گذشتہ صدی کے دوران دوچار ہو چکے تھے اور اب نسبتاً پُرامن ماحول اور قانونی و دستوری نظام میں زندگی گزار رہے تھے لیکن جب بھی دنیا کے کسی بھی کونے سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی خبر آتی تھی ہندوستان کا مسلمان بالکل اُسی شان کے ساتھ تڑپ اُٹھتا تھا جس کا نقشہ اِس شعر میں سامنے آتا ہے کہ ؎ خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!"

اور جذبہ پرور قلم سے اور شائع ہوئے 'الہلال' اور 'البلاغ' میں (از ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء)

پھر کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی عظمت و سطوتِ گذشتہ کے ضمن میں اِس صدی کا سب سے بڑا نوحہ خواں، اُمّتِ مسلمہ کو دنیا کے کسی بھی کونے میں پہنچنے والے دُکھ

اور درد پر سب سے بڑھ کر درد انگیز نالے بلند کرنے والا اور آہ و فغاں کرنے والا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین و ملت کی نشأۃ ثانیہ کے ضمن میں سب سے بڑا حُدی خواں بھی اسی صنم خانۂ ہند سے تعلق رکھنے والا "برہمن زادہ" اور "کافر ہندی" تھا۔ بقول خود اُس کے ؎ "کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق

لب پہ صلوٰۃ و درود، دل میں صلوٰۃ و درود!"

اور ع "برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است!"

چنانچہ وہ کبھی جزیرۂ صقلیہ کو دیکھ کر خون کے آنسو رویا ؎

"رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار — وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی — بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی!
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے — بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
غلغلوں سے جن کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے!"

کبھی ہسپانیہ سے مخاطب ہو کر نوحہ کناں ہُوا ؎

"ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے — مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب و تاب نہیں اُس کے شرر میں!"

کبھی مسجدِ قرطبہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے باطنی سوز و گداز اور ذوق و شوق کا اظہار کرتا ہُوا نظر آتا ہے ؎

"اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز — تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کا کشود
کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں — تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حُسن کی تیرے نظیر — قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

دیدۂ انجم میں ہے تری زمیں آسماں — آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے — عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!"

اور ساتھ ہی ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی نوید جانفزا دیتا دکھائی دیتا ہے۔

"آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب!
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب!"

اور کبھی طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی فاطمہ بنت عبداللہ سے خطاب کرتے ہوئے اپنے جذباتِ ملی کا اظہار کرتا ہے۔

"فاطمہ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے — ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی! تری قسمت میں تھی — غازیانِ دین کی سقّائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اِس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے — نغمۂ عشرت بھی اپنے نالہ، غم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے — ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اِس آغوش میں"

تو کبھی ترکوں کے رنج والم میں شریک ہو کر اور اُن کے مصائب پر اپنے کرب کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل قریب میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خوشخبری بھی سُناتا ہے۔

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے — شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتاب ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے　　یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے　　کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

اور اس کے لیے مسلمانوں کو جو پیغامِ عمل دیتا ہے اُس کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ؎

"تُو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا!
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا!
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تُو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا!
غُبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا!"

الغرض مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کا مزاج ویسے تو ابتدا ہی سے آفاقی رہا ہے لیکن اِس صدی میں تو یہ کیفیت اپنے عروج کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اِس مزاج اور اُفتادِ طبع اور اِس اندازِ فکر و نظر کے وارثِ کامل اور حاملِ اتم مسلمانانِ پاکستان کے قلب و نظر کی ایسی قلبِ ماہیئت کیسے ممکن ہے کہ زمینی تعلق اتنا مضبوط اور وطن کی پرستش اتنی گہری ہو جائے کہ ایک وطنی نیشنلزم —— (TERRITORIAL NATIONALISM) اِس کے استحکام کی اصل اساس بن جائے!

اِس ضمن میں اِس تاریخی تجربے پر بھی نگاہ رہے تو مناسب ہوگا کہ اس صدی کے اوائل میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے پر ایک زبردست عوامی تحریک چلی صرف اور صرف چنانچہ طرابلس میں مسلمانوں کے جھنڈے سرنگوں ہوئے تو عربی زبان میں دردانگیز مرثیہ کہا اعظم گڈھ (یوپی) کے ایک اصلاً ہندی اور نسلاً راجپوت مسلمان عالم و عارفِ کتابِ الٰہی مولانا حمید الدین فراہی رحمہ نے ؎

"کَیْفَ الْقَرَارُ وَقَدْ نُکِسَ　　اَعْلَامُنَا بِطَرَابُلُسَ!!"

(ترجمہ) "قرار کیسے نصیب ہو جبکہ ہمارے جھنڈے طرابلس میں سرنگوں کر دیئے گئے!"

اور اسی طرح کے کتنے ہی درد بھرے مرثیے لکھے اُن کے بزرگ اور رشتے کے بھائی علامہ شبلی نعمانی رحمہ (علامہ شبلی اور مولانا فراہی آپس میں ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائی تھے!) ــــ پھر پوری اُمّتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر خون کے آنسو روئے مولانا حالی جنہوں نے اُمّت کے درد اور اصلاحِ احوال کی بے پناہ آرزو کے تحت اپنی شہرہ آفاق "مسدس" لکھ ڈالی۔ جس کے سرنامے کے یہ دو اشعار تو ابدی اور غیر فانی ہیں کہ ؎

"پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!"

اور اسی طرح آخر میں "مناجات بحضور سرورِ کونین ﷺ" کے یہ دو اشعار بھی نہایت درد انگیز اور رقّت آمیز ہیں: "اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!"

پھر ذرا تصوّر کیجئے اُن جرأت مندانہ اور ولولہ انگیز مضامین و مقالات کا جو پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکوں کی حمایت میں نکلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سحر آفریں ہندوستان میں! ــــ اور اس تحریک کی تیزی اور تُندی کا عالم یہ تھا کہ نہ صرف یہ کہ پورے برِّصغیر کی فضا اس شعر کی صدائے بازگشت سے گونج اُٹھی تھی کہ:

؎ "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو!"

بلکہ ہندوؤں تک کو اس تحریک میں شمولیت اختیار کرنی پڑی تھی۔ اِس لیے کہ آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے شدّت کے ساتھ محسوس کر لیا تھا کہ اگر اِس وقت اِس تحریک کا ساتھ نہ دیا تو پورا پولیٹیکل کیریئر ختم ہو کر رہ جائے گا!

تیسرا سبب : تقسیم در تقسیم کا اندیشہ

اِس ضمن میں تیسری اور آخری لیکن نہایت اہم بات یہ ہے کہ اگر زمینی تعلق ہی کو قومی جذبہ کی بنیاد بنانے پر زور دیا جائے تو اِس سے اتحاد نہیں، انتشار وجود میں آئے گا۔ اِس لیے کہ یہ نظریہ ایک ایسے حیوان کے مانند ہے جو اپنے دشمن کو خود اپنے ہی دودھ سے پالتا ہے۔ چنانچہ 'وطنی قومیت' ہی کے بطن سے علاقائی قومیتیں جنم لیتی ہیں اور اُسی کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پروان چڑھتی ہیں!

اِس ضمن میں بھارت کا معاملہ اگرچہ پاکستان سے قدرے مختلف ہے کہ لفظ بھارت بھی کئی ہزار سال پُرانا ہے اور 'مہا بھارت' کا تصوّر بھی نہایت قدیم ہے جبکہ، جیسا کہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، پاکستان کا تو نام ہی حادثِ محض ہے، اِس کے باوجود 'وطنی قومیت' کے نظریے میں تقسیم در تقسیم کے جو بیج بالقوہ — (POTENTIALLY) موجود ہوتے ہیں اُس کا نقشہ وہاں بھی نظر آ رہا ہے اور علاقائی قومیتیں اور مقامی عصبیتیں نسلی اور لسانی عوامل سے مزید تقویت پاکر نہایت تیزی اور تندی کے ساتھ سر اُٹھا رہی ہیں اور بھارتی قیادت کو اپنی مُلکی وحدت و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم و مسلسل اور شدید و جاں گُسل محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اِس پس منظر میں دیکھا جائے تو پاکستان کا معاملہ بے حد نازک اور کمزور ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کا تو تصوّر بھی پچاس سال سے زیادہ کی تاریخ نہیں رکھتا۔ اور کم از کم اس نام کے ساتھ کسی سیاسی وحدت اور اُس کی عظمت و سطوت کی کوئی تاریخ موجود نہیں لہٰذا اگر اِس کی اساس پر وطنی قومیت کا راگ الاپا گیا تو اصل تقویت سندھی، بلوچی، پختون اور پنجابی قومیتوں کو حاصل ہوگی۔ اِس لیے کہ اگر فی الواقع زمینی رشتہ ہی مقدس ہے تو ایک سندھی کے لیے سندھ کے وطن ہونے کا تصوّر زیادہ قریبی بھی ہے اور قدیمی بھی! پھر اِس کو تقویت دینے کے لیے خاص طور پر لسانی عامل موجود ہے جو نہایت قوت کا حامل ہے! اور ظاہر ہے کہ پاکستان کا لفظ بھی نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں،

اور اِس کی حدود بھی ہرگز نہ کتاب وسُنّت سے ماخوذ ہیں نہ اُن پر مبنی، تو پھر اگر وطن ہی کو پُوجنا ہے تو سرزمینِ سندھ کو کیوں نہ پُوجا جائے! وَقِس عَلیٰ ذٰلِکَ!! بقول غالبؔ
"وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟"

اِس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان کے استحکام کے لیے نہ 'تاریخی تقدس' کا عامل موجود ہے نہ ہی 'جغرافیائی عوامل' اِس کے پشت پناہ ہیں، پھر کوئی نسلی، لسانی یا وطنی قومیّت کا جذبہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اِس کے استحکام کے لیے پختہ اساس اور سنگین بنیاد کا کام دے سکے ـــــ لہٰذا اِس کے استحکام کا کُل دارومدار صرف ایک چیز پر ہے اور وہ وہی ہے جس نے اِسے جنم دیا تھا ـــ یعنی 'مذہبی جذبہ'!! ـــ!! گویا پاکستان کا معاملہ بالکل ع" کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو!" والا ہے کہ اگر اسے اپنی بقا مطلوب ہے اور یہ کسی دوسری طاقت کا طفیلی یا زیردست بن کر نہیں بلکہ باوقار اور باعزّت اور حقیقتاً" آزاد اور خود مختار ہو کر باقی رہنا چاہتا ہے تو اِس کے لیے کوئی اور چارۂ کار سِرے سے موجود ہی نہیں ہے سوائے اِس کے کہ یہ اِسلام کا دامن تھامے اور اُسی کا سہارا لے۔

یہ بات ہر اُس شخص کے لیے اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے جو کسی بھی وجہ سے پاکستان کے بقاء و استحکام کا طالب اور خواہشمند ہو۔ اِس لیے کہ اگر کوئی بدبخت کسی سبب سے اپنے ذہن وقلب سے پاکستان کو بالفعل 'محو' (WRITE – OFF) کر ہی چکا ہو تو بات دوسری ہے، اُس کے لیے تو ہماری یہ پوری بحث ہی غیر متعلق بھی ہے اور لایعنی بھی، لیکن جو شخص بھی دل سے پاکستان کا بقاء و استحکام چاہتا ہو اُس کے لیے انشاء اللہ العزیز ہمارا یہ تجزیہ فیصلہ کُن ثابت ہو گا اور وہ اِس حقیقت کو جان لے گا کہ اگرچہ عوام کی فلاح و بہبود، انتظامی مشینری کی اصلاح و تطہیر اور مختلف علاقوں کے رہنے والوں اور مختلف

طبقات سے تعلق رکھنے والوں کا اعتماد و اطمینان بھی نہایت اہم امور ہیں اور ان کے بغیر بھی یقیناً پاکستان مستحکم نہیں ہو سکتا ـــــ اور خاص طور پر موجودہ حالت میں تو ان کی اہمیت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی ہے اور ان امورِ ثلٰثہ کے ضمن میں جو شدید کوتاہی مسلسل ہو رہی ہے اگر جلد از جلد اُس کی تلافی کی صورت پیدا نہ ہوئی تو شدید اندیشہ ہے کہ یہ بچا کھچا پاکستان بھی ع "تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!" کا مصداق بن جائے ـــــ تاہم پاکستان کے دوام و استحکام کی اصل اساس یہ چیزیں نہیں بلکہ صرف اور صرف اسلامی جذبہ ہے اور اگر وہ جلد از جلد بھرپور انداز میں بروئے کار نہ آیا تو باقی تمام چیزوں کی اصلاح کے باوجود پاکستان یا تو اپنی سالمیت ہی کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور اس کے حصے بخرے ہو جائیں گے یا اگر باقی رہے گا بھی تو کسی دوسری بڑی طاقت کا طفیلی یا زیر دست ہو کر!!!ـــــ

اب اِس سے قبل کہ ہم آگے بڑھیں اور تفصیل کے ساتھ عرض کریں کہ وہ مذہبی جذبہ جو اَب پاکستان کے استحکام کی حقیقی اور واقعی ـــــ اور مضبوط اور پائدار بنیاد بن سکتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً مختلف ہے اُس 'مذہبی جذبے' سے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا اور جو آج سے تقریباً نصف صدی قبل تحریکِ پاکستان کی روحِ رواں بنا تھا ـــــ راقم قائدِ اعظم مرحوم کے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے جملے کے بارے میں اپنی توجیہہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

راقم کے نزدیک قائدِ اعظم کا وہ قول نہ تو اُن کے سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر تھا ـــــ اِس لیے کہ قائدِ اعظم مرحوم خواہ ایک 'مذہبی شخصیت' نہ تھے تاہم ہرگز دنیا کے عام سیاستدانوں کے مانند جھوٹے اور فریبی نہیں تھے اور اُن کے کردار کی مضبوطی، سیرت کی پختگی، ظاہر و باطن کی یکسانیت اور صداقت و امانت کا لوہا اُن کے بدترین دشمن بھی مانتے ہیں ـــــ اِسی طرح اُن کا وہ متنازعہ جملہ حالات کے وقتی دباؤ کے تحت اعصاب کے متاثر ہو جانے کا بھی مظہر نہیں تھا، اِس لیے کہ قائدِ اعظم کے اعصاب ہرگز اتنے کمزور نہ تھے بلکہ وہ واقعتہً فولادی اعصاب کے مالک تھے اور بُرے سے بُرے حالات

میں بھی اُن پر کبھی گھبراہٹ یا سراسیمگی کے طاری ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی —— راقم کے نزدیک اُن کے اِس قول کی اصل توجیہہ اور اُن کے سابق مؤقف کے ساتھ اُس کی مطابقت و موافقت کی صورت یہ ہے کہ پیشِ نظر اوّلاً برِّ صغیر پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے دین و مذہب، تہذیب و ثقافت اور سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت و مدافعت تھی جو قیامِ پاکستان کی صورت میں بتمام و کمال حاصل ہو گئی اور اِن چیزوں کے ضمن میں ہندوؤں کے نامنصفانہ بلکہ منتقمانہ رویّے سے پیدا شدہ خطرات کا سدِّباب ہو گیا، ثانیاً پاکستان میں واقعتہً اسلامی نظام کے بالفعل قیام کے ضمن میں اُن کے پیشِ نظر ایک خالص جمہوری طریقہ تھا۔ یعنی یہ کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں میں جو ایک غالب اور فیصلہ کُن اکثریت میں ہیں، واقعتہً اسلام کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ پیدا ہو جائے اور وہ حقیقتہً اور واقعتہً اسلامی تہذیب و تمدّن کے فروغ اور اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ و اِجراء کے خواہاں بن جائیں تو خالص سیکولر جمہوری نظام بھی اُن کے راستے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بن سکتا اور اُن کے "اجتماعی ارادے" (COLLECTIVE WILL) کے بروئے کار آنے میں ہرگز کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی، لہٰذا فوری طور پر دستوری اور قانونی سطح پر مذہبیت کا راگ الاپنے اور پوری دنیا کو خبردار اور چوکنّا کر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک جمہوری نظام میں قانون سازی کا سارا دار و مدار کثرتِ رائے پر ہوتا ہے لہٰذا اگر بالفرض پاکستان میں ایک سیکولر لیکن حقیقتہً جمہوری نظام قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو دین و مذہب کی جانب پیش قدمی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی!

اب یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو قائدِ اعظم کی اِس رائے سے اختلاف ہو اور وہ اِس طریقِ کار کو اسلامی نظام کے قیام اور قانونِ اسلامی کے نفاذ و ترویج کے لیے درست اور مؤثر نہ سمجھے لیکن اِس توجیہہ سے وہ سارے اِشکال حل ہو جاتے ہیں جو اِس جملے کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ کسی انحراف کا کوئی سوال باقی رہتا ہے نہ کسی وقتی اور فوری سراسیمگی کا —— هٰذَا مَا عِنْدِی وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ!!

پس نوشت

پیش نظر مضامین اس مقام تک وسط اکتوبر ۱۹۸۵ء میں بمقام طائف ضبط تحریر میں آگئے تھے، بقیہ حصے واپسی پر سپردِ قلم ہوئے۔ اس اثنا میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے متعلق بعض کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے راقم کی نگاہ سے علامہ اقبال مرحوم کی ایک تحریر کا اقتباس گذرا جس سے ایک تو مزید انشراح حاصل ہوا کہ قائدِ اعظم کے متنازعہ الفاظ کی جو توجیہہ مَیں نے کی ہے وہ بالکل درست ہے، دوسرے اِس احساس کو تقویت حاصل ہوئی ہے کہ مصورِ پاکستان اور معمارِ پاکستان دونوں کے ذہن وفکر میں غایت درجہ ہم آہنگی اور یکسانیت تھی، علامہ مرحوم نے "قادیانیت" کے موضوع پر پنڈت نہرو سے مراسلت کے دوران میں کسی موقعہ پر لکھا:

"قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے، جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کے مغربی تصوّر کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی . . . ."

("پاکستان کی نظریاتی بنیادیں"
مؤلفہ ڈاکٹر وحید قریشی ص ۸۵-۸۴ بحوالہ "حرفِ اقبال" ص ۱۲۳)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ انکا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں انکو صحیح اسلامی طریقے کیمطابق بیحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہر دانہ منتخب

فریش ویل
بادام اور پستہ

تلے ہوئے۔ تازہ
مصالحے دار۔ ذائقے دار

نمکینیت کے نئے پہلو اور
بھرپور ذائقے کے ساتھ

ناشتے پر
چائے پر یا کسی بھی وقت
لذت میں ایک خوشگوار اضافہ

جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر
پیک کیے جاتے ہیں۔
سیل بند ڈبے کو کھولنے کا سہل ترین
طریقہ پاکستان میں پہلی بار
ہم نے متعارف کرایا۔

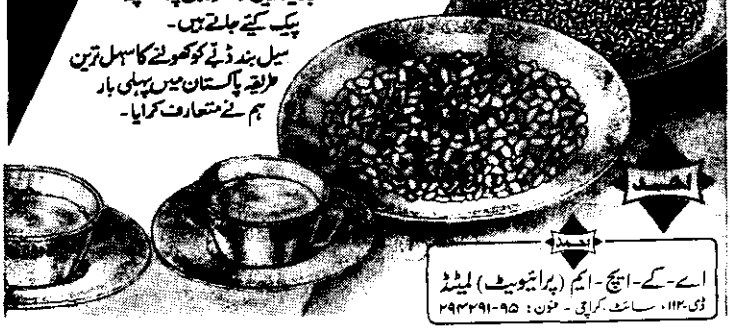

اے۔کے۔ایچ۔ایم (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی ۱۱۲، سائٹ، کراچی۔ فون: ۲۹۳۲۹۱-۹۵

Coca-Cola
Coca-Cola is it!
TRADE MARK REGD

دِلِ افگندیم

(آخری قسط)

بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا

مولانا سعید الرحمٰن علوی

نظمِ جماعت اور بیعت کی بنیاد پر انقلابی جماعت کی تشکیل کی فکر

اس دور میں حضرت شیخ الہند کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ہے جس کی پشت پر حضرت الامام الشاہ ولی اللہؒ کی فکر اور حضرت الامیر السید احمد بریلویؒ کا طریق کار تھا، یعنی ایک انقلابی جماعت کی تشکیل، جو بیعت کی بنیاد پر تیار ہوا۔

اسلام آباد کے ایک نیم حکومتی ادارہ "تحقیق تاریخ و ثقافت" کے اہتمام میں "جمعیۃ علماء ہند" نامی دو ضخیم مجلدات پر مشتمل کتاب اور محترم ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کی کتاب "نظمِ جماعت" مطبوعہ لاہور (سنی پبلیکیشنز اردو بازار) کا اس سلسلہ میں مطالعہ بڑا مفید ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد خُلد آشیانی کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے دینِ اسلام کے چشمہ ہائے صافی اور تاریخ کے مستند حوالوں سے اہلِ علم و عرفان کو اس طرف متوجہ کیا اور حضرت شیخ الہندؒ جیسے عظیم المرتبت انسان نے اس "چھوٹے" کی بات کا وزن محسوس کر کے اس کا اعتراف فرمایا کہ

"اس نوجوان نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔"

گویا تاریخ کی گنتی کی شخصیات میں سے ایک یعنی "شیخ الہندؒ" نے اپنی عظمت کا ثبوت اس طرح دیا کہ بقول کسے ایک "رندِ قدح خوار" کو جوہر قابل سمجھ کر اسے اس مقصد کے لئے نہایت درجہ موزوں انسان قرار دیا اور اس کی خواہش ظاہر کی کہ وہ آگے بڑھے۔

مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی قدس سرہٗ کے حوالہ سے یہ روایت چھپ چکی ہے کہ ایک موقعہ پر جب مدرسہ دیوبند کے اہلِ حل و عقد نے بوجوہ مولانا آزاد کی مدرسہ میں آمد پر پابندی لگائی تو "شیخ الہند" بھی مدرسہ نہ گئے اور بعض حضرات کے سوال پر فرمایا:

"کامل اس فرقۂ زُہّاد سے اٹھا نہ کوئی ... کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے"

المیہ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند، جن کی ذات گرامی پر اس سلسلہ میں بریلی کے ایک گھرانے کے علاوہ (جن کی اس زمانہ میں خاص اہمیت نہ تھی) پورا ہندوستان متفق تھا، ان کی زندگی ٹمٹماتا چراغ تھی تو شیخ الہند جیسے موزوں سمجھتے تھے (مولانا آزاد) ان پر اس وقت بوجوہ اتفاق نہ ہو سکا (جس کی تفصیل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مضامین میں آچکی ہے) وقتی طور پر عدم اتفاق کا یہ سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ دوبارہ اس کی پھر نوبت ہی نہ آئی (انفرادی اور صوبائی سطح کی مثالیں مستثنیٰ ہیں) اگر یہ کام اس وقت ہو جاتا تو ملت کی تاریخ مختلف انداز سے مرتب ہوتی۔ لیکن "وکان امر اللہ قدراً مقدوراً"

جمعیۃ علماءِ ھند کا کردار

جمعیۃ علماء ہند، جو گویا شیخ الہند کے فکر کی حامل جماعت تھی، اور جسے حضرت اس انداز سے منظم کرنا چاہتے تھے کہ تحریک شہیدین کا رنگ اس میں پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے عظیم رہنما کے انتقال کے بعد اس طرح نہ سہی، لیکن پوری بے جگری سے مصروف کار رہی، اس کے پیش نظر ملک کی آزادی بھی تھی اور امت مسلمہ کی بہبود، اس کے مفادات کا تحفظ اور اس کی اقدار کی حفاظت بھی!

جمعیۃ کے معاملے میں میرے جذبات و احساسات کی کیفیت سے ہر وہ شخص واقف ہے جس کا مجھ سے کسی بھی دائرہ میں تعلق رہا۔ اس جماعت اور اس کے اکابر سے متعلق میری واضح رائے تھی اور ہے کہ یہ حضرات سب سے زیادہ آزادی خواہ تھے، ان کی قربانیاں سب سے زیادہ ہیں اور انھوں نے ہمیشہ قائدانہ حیثیت سے اپنا رول ادا کیا۔ جمعیۃ کی تاریخ کا یہ اعزاز اس سے کوئی نہیں چھین سکتا کہ اس نے مسلم لیگ چھوڑ کانگریس سے بھی پہلے مکمل آزادی کے پروگرام کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ کانگریس سے معاہدہ کیا یا کسی موقع پر مسلم لیگ سے، ہر جگہ اس کے پیش نظر محض اسلام اور مسلمانوں کی روایات تھیں۔ اگر کسی "معاہد" نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو اس سے کھلا اختلاف کیا اور کسی بھی شکل میں اپنی روایات کو ترک نہیں کیا۔ (اس سلسلہ میں توفیق الٰہی سے ایک الگ مضمون کی کوشش کروں گا، والامر بید اللہ تعالیٰ)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس جماعت کے لئے "ضمیمہ" کا لفظ استعمال کیا تو اس سے جہاں اور حضرات کو صدمہ پہنچا وہاں مجھے بھی بے حد کوفت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بعد میں تقریراً و تحریراً اپنی بات کی وضاحت کر دی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہے دانستہ کسی سے ضمیمہ ہو جانا اور جان بوجھ کر کسی کے نقش پا پر چلنا۔ جمعیۃ کے اکابر اس سے بہت بلند تھے، ایک شکل یہ ہے کہ کسی کے عمل سے

کوئی دوسرا ایسا نتیجہ اخذ کرلے، اس کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کے بعد تقسیم کے سوال پر کانگریس و مسلم لیگ کے کیمپ لوگوں کی نظر میں مستقل قرار پائے تو جمعیۃ سمیت باقی سب جماعتوں کو لوگوں نے ان سے جوڑ دیا، ایسی سوچ بہرحال لوگوں میں تھی، جس سے اس قسم کا نتیجہ نکالا گیا لیکن ضروری نہیں کہ یہ نتیجہ اور یہ سوچ صحیح ہو اور میری نہایت نپی تلی رائے یہ ہے کہ جمعیۃ کا انفرادی مزاج، اس کی خصوصیات بالکل برقرار رہیں۔

تاریخ کی مظلوم شخصیت، مولانا آزاد

رہ گیا معاملہ مولانا ابوالکلام آزاد کا، تو وہ تاریخ کی مظلوم ترین شخصیات میں سے ایک ہیں، بیگانوں سے کیا گلہ، انہوں نے بھی ان سے انصاف نہیں کیا۔ دنیا کا کون سا الزام ہے جو ان پر نہیں لگایا گیا، حتیٰ کہ اس کی دشمنی میں، اس کی قید کے زمانہ میں اس کی عفیفہ بیوی کے جنازہ پر خشت باری کی گئی اور یہ کام انہوں نے کیا اور کرایا جو مستقبل میں اسلام کے دعویدار بن کر سامنے آرہے تھے۔ حضرت امیر شریعت السید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اسی جنازہ کے ساتھ اس بدسلوکی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تقریر میں جو کچھ کہا تھا، وہ پورا ہوا اور تقسیم کے ہنگاموں میں، عزتیں، جانیں اور مال اس طرح برباد ہوئے کہ الامان! خیر ہم تلخی سے الگ رہ کر اپنے محترم قارئین کو توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ حالات کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ زمانہ تغیر پذیر ہے، اس کے تقاضے مختلف ہوتے رہتے ہیں اور ایک دیدہ ور قائد و رہنما حالات کی مناسبت سے بنیادی اصولوں پر قائم رہ کر منصوبہ بندی کرتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت خاتم النبیین والمعصومین محمد عربی علیہ السلام کا اسوہ ہمارے لئے سب سے بڑی دلیل ہے، آپ کو کہیں "كُفُّوا اَيْدِيَكُمْ" کا حکم ہے تو کہیں "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" کا مرحلہ نظر آتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند جس کے حوالہ سے گفتگو ہو رہی ہے، اس میں حالات کی رفتار جس انداز سے سامنے آتی ہے، اسی انداز سے مسلم رہنما سرگرم عمل نظر آتے ہیں "الف ثانی" کے بعد جب اس خطہ کو "مرکز تجدید" بننے کا شرف حاصل ہوا تو "باب تجدید" کے "فاتح" حضرت الامام مجدد سرہندی قدس سرہٗ اہل اقتدار سے روابط قائم کرکے ان کی اصلاح میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ حضرت الامام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک مرحلہ پر نواب نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی سے روابط قائم کرکے "اصلاح احوال" کے لئے فکرمند ہیں تو وہی "امام زماں" پھر "تعلیم، تدریس، تصنیف اور تزکیہ" کے ہو کر رہ جاتے ہیں ـــــ ہم نے پہلے اشارہ کیا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ فکری تطہیر و تزکیہ کے بعد مخلصین" کی جماعت تیار ہوگی تو بات بنے گی۔ ان کے خلف عزیز شاہ عبدالعزیز نے جب محسوس کیا

کہ اب تطہیرِ فکر کا کام ہوگیا، اور اب" اقدام" ممکن ہے تو انہوں نے حضرت الامیر السید بریلوی کو اس مہم پر لگا دیا، سید صاحب قبلہ نے اقدام کے ساتھ حکمرانوں سے روابط کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا (جیسا کہ ان کے مکتوبات سے ظاہر ہے) اس طرح اس خطہ میں ۱۸۵۷ء تک اقدامی حالات کی کیفیت غالب رہی اور ۱۸۵۷ء کے بعد اسی قافلہ کے باقی حضرات نے حالات کے پیش نظر نئی منصوبہ بندی کی جس پر حضرت شیخ الہندؒ کے دور تک کام ہوتا رہا، حتیٰ کہ شیخ الہندؒ نے پھر اقدام کا فیصلہ کیا لیکن اہل نظر واقف ہیں کہ آپ کی اسارت کے باعث (جس کے اسباب و وجوہات کی داستان کا موقعہ نہیں) اقدام کا موقعہ ہی نہیں آیا۔

اس پورے پس منظر اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ہی ابوالکلام جیسے " نابغہ" کے کردار کا جائزہ لینا ہوگا۔ مولانا قرآنی فکر اور جہاد کے ذریعہ جس انقلاب کی خاطر اٹھنے کا عزم رکھتے تھے اور جس کیلئے انہوں نے اپنی بساط کے مطابق ۱۹۱۳ء ہی میں بیعت کی اساس پر" حزب اللّٰه" قائم کردی تھی ظاہر ہے کہ اس کی مؤثر عملی صورت اسی جماعت سے بنتی جو شیخ الہندؒ بنانا چاہتے تھے۔ جن کے ہاتھ پر خود انہوں نے ۱۹۱۵ء میں بیعت کرلی تھی لیکن جب وہ نہ بن سکی تو" ابوالکلام" نے اپنی عظمت و مقام کے پاسِ خاطر سے پھر کبھی اس کا نام تک نہ لیا، البتہ وہ قرآنی فکر کی طرف برابر لوگوں کو توجہ دلاتے رہے۔ جب وہ بھرپور سیاسی جنگ لڑ رہے تھے اور قومی آزادی میں سرگرم عمل تھے، اس وقت بھی یہ نغمہ ان کی زبان پر تھا۔ جس کا ثبوت رام گڑھ اجلاس کانگریس کا خطبۂ صدارت ہے، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ملکی حالات ایسے گھمبیر ہوتے چلے گئے کہ مولانا اور ان کے رفقاء اس انداز سے نظم جماعت کا کام نہ کرسکے لیکن قرآنی بصیرت کی طرف لوگوں کو بلانا اور اس روشنی کی دعوت دینا، برابر جاری رہا، اسی حقیقت کی طرف محترم ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہ جہان پوری نے چند سال قبل انجمن خدام القرآن کے محاضرات میں توجہ دلائی ان کا مقالہ" حکمتِ قرآن" میں شائع شدہ موجود ہے اور اسی انداز کا ان کا ایک مقالہ اس دور میں احقر نے "ہفت روزہ خدام الدین لاہور" میں چھاپا (جب میں اس کا مدیر تھا) ____ مقصد اس سے یہی تھا کہ لوگوں کی توجہ قرآن کی طرف ہو، وہ اس کتاب ہدیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس کی روشنی میں اپنا نظم بنائیں ____ افسوس اس خطہ کے رنگا رنگ سیاسی حالات نے انہیں اس کا موقع فراہم نہ کیا، حتیٰ کہ ملک تقسیم ہوگیا اور اب ایک نئی صورت پیدا ہوگئی۔ مولانا اس کیمپ میں تھے جو تقسیم کا حامی نہ تھا بلکہ اس قافلہ کے سرخیل، جس خطہ میں وہ رہ گئے اس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم اور خوف کی تلوار ہر وقت ان پر مسلط، ابوالکلام نے اس دور میں اپنی وفات تک اس خوف و ہراس کو

دور کرنے کی فکر کی مسلمانوں کو عقیدہ و عمل کے اعتبار سے مخلص مسلمان بننے کی تلقین کی اور برابر وہ نغمہ الاپتے رہے جس کے سبب ان کی روح ہمیشہ بیقرار رہی۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی مولانا آزاد کے بعد "تجدید و احیائے دین" کے لئے انقلابی انداز کی حامل جماعت کے قیام کی کوشش

مولانا مودودی نے کی تو اس کے لئے انہوں نے مولانا آزاد ہی کے فکر سے اقتباس کرتے ہوئے قرآن و جہاد کو اساس بنایا اور اگر انہوں نے مولانا آزاد سے اپنے اس فکری تعلق کے اعتراف میں تامل کیا تو اس کے چند در چند اسباب تھے جن کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔

بہرحال ان کی دعوت و پکار میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے اساطین علم ادھر متوجہ ہوئے بلکہ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا صبغۃ اللہ بختیاری مدراسی (حال سربراہ تحریک احسانی) جیسے حضرات تو اتنے شدید درجہ کے وکیل بنے کہ نہ صرف دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور بلکہ آستانہ عالیہ تھانہ بھون تک دعوت لے کر گئے لیکن افسوس یہ ہوا کہ یہ قافلہ اتنی جلدی منتشر ہونا شروع ہوا کہ اس کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔ چنانچہ اوّلاً مولانا نعمانی اور مولانا علی میاں ایسے حضرات نے اس وقت کی کل ممبر شپ کی تقریباً ایک تہائی تعداد کے ساتھ علیحدگی اختیار کی اور تقسیم کے بعد تو محفل اس طرح اجڑی کہ وہ پھر رنگ کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی ایسے بزرگ مصنف و عالم سے لے کر ڈاکٹر اسرار احمد ایسے نوجوان اور باہمت کارکن تک بڑی تعداد قافلہ سے جدا ہو گئی۔ بنابریں آج جماعت قیادت کے شدید بحران سے دوچار ہے۔

تقسیم سے قبل کی علیحدگی اور تقسیم کے بعد کے بحران کے اسباب ڈھکے چھپے بھی نہیں۔ لیکن اس وقت کی گفتگو کے دائرہ سے باہر ضرور ہیں۔

اس کوشش کی ناکامی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ مولانا مودودی علوم عالیہ قرآن و سنت کے سلسلہ میں استناد سے محروم تھے۔ علماء کے ایک طبقہ نے اس سے خطرات محسوس کئے اور ایک موقع پر تحریک تحفظ ختم نبوت کے نامور رہنما، بیدار مغز عالم، امام العصر سید محمد انور شاہ کاشمیری قدس سرہ کے مخصوص شاگرد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے رفیق و جلیس مولانا محمد علی جالندھری اور مشہور محدث و فقیہ مدبر سیاست دان اور مفکر مولانا مفتی محمود رحمہما اللہ تعالیٰ جیسے مخلص حضرات نے انہیں توجہ بھی دلائی اور خاص طور پر تفسیر قرآن اور فقہی معاملات میں احتیاط کا مشورہ

دیا تاکہ باقی دائروں میں ان کی صلاحیتوں سے ملک فائدہ اٹھا سکے لیکن افسوس کہ اس مشورہ کی پذیرائی نہ ہوئی۔

تقسیم کے بعد ملک کے دونوں حصّوں کی نہایت ذمہ دار اور مخلص علمی و فقہی شخصیات نے ان کے فکر و علم کی غلطیوں کو میزان میں تولنا ضروری سمجھا اور مسئولیتِ آخرت کے احساس کے سبب انہیں بسا اوقات شدید قسم کی زبانِ فتویٰ تک استعمال کرنا پڑی۔ شیخ الاسلام حضرت الامام السید حسین احمد مدنی، شیخ التفسیر حضرت الامام مولانا احمد علی لاہوری سے لے کر بوذرِ عصر، مجاہد گرامی مولانا غلام غوث ہزاروی (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے بہت سے لوگ بوجوہ الرجک ہو سکتے تھے (گویا ان کی الرجی کی بنیاد بھی صحیح نہیں) لیکن تاریخ میں ایسا موڑ بھی آیا بلکہ کئی موڑ کہ حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی، فقیہہ ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، محدّث کبیر، مہاجر مدینہ مولانا محمد ذکریا سہارنپوری، امیر المومنین فی الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی اور مفتی اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے حضرات بھی فکر و علم کی غلطیوں پر خاموش نہ رہ سکے۔

مثال کے طور پر مولانا محمد شفیع صاحب کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیں جو ان کی مختلف فقہی تحریرات کے نہایت درجہ قابلِ قدر مجموعہ "جواھر الفقہ" (۲ جلد) کی پہلی جلد کے صـ۱۷۱ پر ہے۔ فرماتے ہیں:

"احقر کے نزدیک مودودی صاحب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ عقائد اور احکام میں ذاتی اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں، خواہ ان کا اجتہاد جمہور سلف کے خلاف ہو۔ حالانکہ احقر کے نزدیک منصب اجتہاد کے شرائط ان میں موجود نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی تحریروں میں علماء سلف یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر تنقید کا جو رویہ اختیار کیا ہے وہ انتہائی غلط ہے۔ خاص طور سے خلاف و ملوکیت میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو جس طرح ہدفِ تنقید ہی نہیں بلکہ ملامت کا ہدف بھی بنایا گیا ہے وہ جمہور علماء اہلسنّت کے طرز کے بالکل خلاف ہے۔ نیز ان کے لٹریچر کا مجموعی اثر بھی اس کے پڑھنے والوں پر یہ بکثرت یہ محسوس ہوتا ہے کہ سلف صالحین پر مطلوب اعتماد نہیں رہتا اور ہمارے نزدیک یہ اعتماد ہی دین کی حفاظت کا بڑا حصار ہے۔ اس سے نکل جانے کے بعد پوری نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ بھی انسان نہایت غلط اور گمراہ کن راستوں پر پڑ سکتا ہے"۔

اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی جیسا فرشتہ سیرت انسان، باوجود سابقہ تعلق اور باوجود اس کے کہ بعد میں بھی مولانا سے ان کا مخلصانہ رشتہ استوار رہا "چار بنیادی اصطلاحات" پر قلم اٹھانے پر

مجبور ہو گیا، اور اسی پر بس نہیں مصر کے "الاخوان" کے مرشد ثانی الشیخ حسن الھضیبی مرحوم نے اپنی کتاب " دعاۃ لا قضاۃ " میں اس فکر پر تنقید کی ۔ معاملہ قرآن وجہاد اور اس کے حوالہ سے نظم جماعت تک رہتا تو تاریخ کے دھارے کی کیفیت اور ہوتی، لیکن اشہب قلم کی برق رفتاری جب خرمن اسلاف کو لپیٹ میں لینے لگی تو پھر کون تھا جو نہ بدکتا ۔۔۔ مولانا سید علی میاں نے اپنی کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" میں مولانا مودودی کے دور حیدر آباد کے مضامین ورسائل اور اسی طرح جماعت کی تشکیل کے بعد بالکل ابتدائی دور کی خدمات کو سراہنے کے بعد جو بات لکھی، وہ ہمارے دل کی آواز ہے :

> اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر وہ اسی کام کو اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار کا میدان اور اپنی زندگی کا مقصد وموضوع بنا لیتے، لیکن انہوں نے اس کے ساتھ فکر اسلامی کی تشکیل جدید یا " الٰہیات اسلامیہ" کی تشکیل جدید کے طرز کا کام شروع کیا ..... الخ (صفحہ ۳۰ طبع سوم مطبوعہ کراچی)

بقول مولانا علی میاں اس معاملہ میں انہوں نے " قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نامی اپنی تحریر کو بنیاد بنایا اور ثابت کرنا چاہا کہ ایک محدود مدت کو چھوڑ کر بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان الفاظ کے اصلی معانی ہی بدل گئے اور ایسا پردہ پڑا کہ قرآن کی تین چوتھائی سے زائد تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی (مفہوم مولانا علی میاں صد ۱۲-۲۰)

اے کاش مولانا مودودی، مخلص اہل تنقید کی بات کا وزن محسوس کرتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی اور علی میاں کے بقول اپنی تحریروں سے ایک طبقہ کو اسلام کے معاملہ میں جو شعور بخشا تھا وہ طبقہ ملت کے اعلیٰ مقاصد کے کام آتا لیکن فیا حسرتا ۔۔۔ ایسا نہ ہو سکا، حتیٰ کہ جماعت میں بدقسمتی سے ایک عنصر ایسا بھی پیدا ہو گیا جو ہر کسی کو مستحق تنقید سمجھتا ہے ۔ نہیں سمجھتا تو مولانا کی ذات کو، اس کے باوجود ایسے لوگوں کی بالخصوص نوجوانوں کی کمی نہیں، جنہیں حکمت وتبلیغ اور احسن انداز سے اب بھی عظیم مقاصد کے لئے ساتھ لیا جا سکتا ہے، محبت وخلوص بڑا قیمتی سرمایہ ہے، اس سرمایہ کا استعمال مفید نتائج پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے ۔ اب جبکہ مولانا مودودی اس دنیا میں نہیں، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہوئے ان کے اخلاف واعوان سے یہ درخواست بیجا نہ ہو گی کہ وہ حزبی اور گروہی فکر کے دائرہ سے نکل کر اسلام اور ملت کے وسیع تر مفاد میں سوچنے کی فکر کریں، اور یہی درخواست ہر اس باشعور شہری سے ہے جو اس وقت وطن عزیز ہی نہیں، پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کا خواہاں ہے، لیکن سوچ لیں کہ اس کا انحصار وسعت ذہنی وفکری، خلوص ومحبت اور جہد مسلسل پر ہے" اپنے اپنے

حزب اور فکر میں محصور رہ کر ہر شخص اپنی عقیدت کا چراغ تو جلا سکتا ہے، ملت و امت کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔

مولانا مودودی سے متعلق ایک اہم سوال

اس مرحلہ پر ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مولانا مودودی نے واقعتہً طریق سلف پر تنظیم کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو جوڑنے کی کوشش کی تھی تو انہوں نے اپنی جماعت کی اساس بیعت پر کیوں نہ رکھی؟ یہ سوال بہر حال اہم ہے لیکن ظاہر ہے کہ کم از کم میرے پاس اس کا کوئی واضح اور مفصل جواب نہیں۔ اس کا جواب یا مولانا خود دے سکتے تھے۔ یا ان کی فکر کے حامل حضرات دے سکتے ہیں، میں تو صرف اسی قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ دنیا سے جانے والے جا چکے۔ ان کا نامۂ عمل لپیٹ دیا گیا۔ اب زندوں کا معاملہ ہے۔ ان سے ان کے افکار و اعمالِ حیات کا حساب ہونا ہے۔ ان پر لازم ہے کہ "وہ خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے" (یہ الفاظ مولانا ہی سے مستعار لئے گئے ہیں) اپنا بوجھ کسی پر نہ ڈالیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عقل اور فہم سے اپنی آخرت کی فکر کریں۔

رب العزت انہیں، ہمیں اور سبھی کو راہِ حق کا مردِ کار بنائے اور آخرت کی رسوائی سے محفوظ رکھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی

مولانا مودودی کے بعد اب قرآن اور جہاد ہی کی اساس پر ایک انقلابی طرز کی نئی دینی جماعت کے قیام کا بیڑا اٹھایا ہے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اور انہوں نے تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھی ہے بیعت پر۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی داستان حیات ان کے بہت سے مضامین کے ذریعے سامنے آچکی ہے "سرافگندیم" نامی کتابچہ بھی اسی سلسلہ میں ہے موجود ہے کہ وہ کن کن مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچے اور اپنا موجودہ کام شروع کیا۔ احقر سے ان کے ربط و ضبط کی داستان اس مضمون کی پہلی قسط میں تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن حکیم سے گہرا قلبی تعلق اور غیر معمولی ذہنی مناسبت عطا فرمائی ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے معانی و مضامین کے بیان اور خصوصاً اس کی دعوت کی اشاعت کی نمایاں صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے اور اگرچہ ان کے حالیہ دورۂ ہند کے موقع پر جامعہ رحیمیہ، درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مہتمم مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ نے ان کے علم و فہم دینی اور وسعت مطالعہ و معلومات کے پیش نظر انہیں دستار فضیلت بھی عطا فرمادی ہے تاہم انہیں قطعاً یہ دعویٰ نہیں کہ وہ مستند عالم ہیں بلکہ وہ میڈیکل کی تعلیم سے قبل، اس دوران اور بعد میں اہل علم سے استفادہ کرتے رہے۔ اسی کا وہ اظہار کرتے ہیں اور اس معاملہ میں مولانا امین احسن اصلاحی کے سب سے زیادہ ممنونِ احسان ہیں اور اس کا انہیں اعتراف ہے۔

میرے علم کے مطابق انہوں نے بہت سے لوگوں کی خواہش کے باوجود قرآن عزیز کے جدید ترجمہ

یا تفسیر کی ترتیب کی حامی نہیں بھری، وہ اسلاف کی خدمات کے اس سلسلہ میں زبردست معترف ہیں اور خاص طور پر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ اور مولانا عثمانی قدس سرہٗ کے تفسیری نوٹس کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔ بہرحال اس لاہور میں انہوں نے "رجوع الی القرآن" کے ذریعہ کام شروع کیا اور جب اس کے نتیجے میں احباب و رفقاء اور اعوان و انصار کا ایک حلقہ وجود میں آگیا تو "قیامِ جماعت" کی سعی و تدبیر کی اور اپنی ہمت و بساط کے مطابق ایک ڈھانچہ کھڑا کر دیا اور اب اسی کے لئے زندگی کھپانے کا عزم رکھتے ہیں ـــــ مجھے اسی چیز نے اپیل کی اور میں نے "مقصد کی راہ" میں شرکت و تعاون کا فیصلہ کیا۔

ہر ہر جزء میں کسی کا کسی سے متفق ہونا نہ ضروری ہے نہ ممکن، تاہم مقاصد کی راہ ایسی ہوتی ہے جس کے لئے جزوی اختلافات رکاوٹ نہیں بنتے، قرآن عزیز کا اصول معاونت "تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" ہے اور اسی کو میں نے سامنے رکھا۔

علمی مسائل و افکار میں مسلسل باہم گفتگوئیں ہوتی رہتی ہیں، میں خود ناقص العلم ہوں بلکہ بالکل تہی دامن لیکن اساتذہ کے حسنِ تربیت کے نتیجہ میں جو روشنی میسر آئی ہے۔ وہ بحمد اللہ میری رفیقِ راہ ہے۔ اس کے نتیجہ میں یا کسی مخلص خادم دین کے کسی مخلصانہ مشورہ کے نتیجہ میں کوئی بات میرے سامنے آئی تو اس کی روشنی میں موصوف سے گفتگو کرنا اور اس کے بعد صحیح فیصلہ پر پہنچنا میری زندگی کا حصہ رہے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)۔ اللہ نہ کرے کسی وقت ایسا محسوس ہوا کہ افکار کی دنیا میں ایسا بعد پیدا ہو گیا ہے جو باہمی معاونت میں رکاوٹ ہے تو "ما نجیر شما بسلامت" کہہ کر اس کوچہ سے علیحدگی میں دیر نہ لگے گی۔

فی الوقت میری جو دیانت دارانہ رائے تھی میں نے اس کا لحاظ کر کے "تنظیم اسلامی" کو اپنایا ہے، رب العزت اپنے کرم بے پایاں سے ڈاکٹر صاحب کو مجھے، جملہ رفقاءِ تنظیم بلکہ ہر کلمہ گو کو اپنے فرائض کے صحیح احساس اور انکی ادائیگی کے لئے مخلصانہ جہد و سعی کی توفیق سے نوازیں، دلوں کے زیغ و ضلال سے حفاظت فرمائیں اور حسن خاتمہ کی نعمت سے سرفراز فرمائیں۔ ع

"ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!!"

رہا مسئلہ بیعت تو اگرچہ اس کے ضمن میں اب سے بہت پہلے مولانا سید حامد میاں خلیفہ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ "قولِ فیصل" ارشاد فرما چکے ہیں جو "میثاق" میں شائع ہو چکا ہے۔ تاہم اس اجمال کی کسی قدر تفصیل خصوصاً ماضی قریب کی تاریخ کے حوالے سے ان شاء اللہ مفید ہوگی۔

ایک اصولی بحث بسلسلہ امارت و بیعت (قندِ مکرر)

پچھلی مفصل تحریر میں ہم نے کوشش کی کہ ہم حدیثِ پاک کی روشنی میں اس امر کو واضح کر سکیں کہ اس امت کا معاملہ دوسری امتوں سے مختلف ہے۔

اس کے آقا اور ہادی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول و نبی تھے، ان کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی اس پیغام کو دنیا میں باقی رہنا تھا جسے لے کر وہ آئے تھے ـــــ اسی حقیقت کی طرف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں توجہ دلائی، جو انہوں نے اس وقت ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ کے نبی دنیا سے رخصت ہوئے۔ (ترجمہ ملاحظہ فرمائیں)

اگر تو لوگ حضرت محمد علیہ السلام کی پرستش کرتے تھے تو بے شک وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے تو بے شک وہ زندہ ہے، کبھی نہ مرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وما محمد الا رسول .....الخ

چنانچہ ہم نے کوشش کی کہ اس سلسلہ کی روایات، ان کے الفاظ میں جو اختلاف ہے، اور ذمہ دار شخصیات کے حوالہ سے اسکا مفہوم واضح ہوجائے۔ ساتھ ہی تاریخی طور پر اپنی سمجھ میں جو کچھ آیا، یا جو ہمارا تھوڑا بہت تاریخی مطالعہ ہے اس کی روشنی میں ضروری گذارشات پیش کر دیں۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ بہت طویل ہو گیا لیکن بہرحال یہ حالات کا تقاضا تھا، خاص طور پر برعظیم پاک و ہند کے حوالہ سے حضرت الامام مجدد الف ثانی اور حضرت الامام الشاہ ولی اللہ قدس سرھما اور ان کی تحریک سے متعلق بہت سی باتیں نوک قلم پر آگئیں اور یہ سلسلہ بڑھتا اور پھیلتا ہوا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا جو گذشتہ صدی کے رجال دین میں سے ایک اہم شخصیت اور مقام تجدید پر فائز ہونے والے باکمال انسان تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے فکر و فلسفہ کی بنیاد پر اور اسلام کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں برعظیم میں "نظم جماعت" کا اہتمام حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کیا کہ منصب امارت و امامت کے لئے حضرت سید احمد بریلوی کو موزوں قرار دے کر پورے حلقہ کو ان سے وابستہ کر دیا اس کے بعد یہی جھلک ۱۸۵۷ء کے دوران نظر آتی ہے۔ جب حضرت الامیر حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر کے اہل علم و مردان احرار کا ایک قافلہ ترتیب پا یا رہا۔ حضرت سید صاحب کی طرح حضرت حاجی صاحب کا ظاہری علم کے اعتبار سے معاملہ قریب قریب برابر تھا۔ لیکن ایک "طریق خیر" کے احیاء کی غرض سے بڑے بڑے اہل علم ان سے وابستہ ہوئے ـــــ سید صاحب سے وابستہ ہونے والے بعض حضرات کا تذکرہ اپنی جگہ آچکا ہے۔ حاجی صاحب سے وابستہ ہونے والے حضرات میں دو نام ایسے ہیں جو اس دور کے ہندوستان کے جملہ اہل علم پر بھاری تھے یعنی قاسم العلوم والخیرات مولانا

محمد قاسم نانوتوی اور فقیہ عصر، محدث کبیر مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہما، حاجی صاحب کی قیادت میں ان دو حضرات نے باقاعدہ جنگ کی طرح ڈالی جس میں حاجی صاحب کے پیر بھائی حضرت حافظ ضامن رحمہ اللہ تعالیٰ شاملی کے میدان میں شہید ہوئے۔ اس "اقدام" کے سلسلہ میں اہل علم میں علمی اختلاف رونما ہوا۔ بحث ہوئی۔ لیکن اقدام کے حامی غالب قرار پائے۔ جن کی ترجمانی مولانا نانوتوی کر رہے تھے۔

اس کے بعد اسی انداز و فکر سے "نظم جماعت" کا مرحلہ شیخ الہند قدس سرہٗ کی حیات مبارکہ میں پیش آیا جس سے قارئین میثاق بہت حد تک واقف ہیں۔ نظم جماعت، بیعت کی بنیاد پر اور امارت کے مسئلہ کو بہت الجھایا جاتا ہے۔ حالانکہ بات مختصراً یہ ہے کہ اسلام اور دین فطرت کے لیے ارباب عزیمت ایک قافلہ ترتیب دے کر رخت سفر باندھنے کی فکر کرتے ہیں اور ایک شخص ان کی قیادت و رہنمائی کا فرض سرانجام دیتا ہے اور بس! ——— اور اس سے بہت پہلے تاتاریوں کے دور فتن میں حضرت الامام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ، اسی انداز کی جماعتی زندگی سے متعلق اہل علم اور مسلمانوں کو توجہ دلاتے نظر آتے ہیں، اس سلسلہ کی تفصیلات محترم ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہ جہان پوری نے "تحریک نظم جماعت" نامی کتاب میں جمع کر دی ہیں اور ساتھ ہی شیخ الہند اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اس سلسلہ کے افکار اور کاوشیں اس کتاب کا حصہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا آزاد کو اس دور میں اس معاملہ میں پہل کرنے کی سعادت و شرف حاصل ہے اور مولانا محمود حسن جو اس وقت پوری ملت ہی نہیں بلکہ برادران وطن کے یہاں بھی، قابل احترام اور مرکزی شخصیت تھے، انہوں نے مولانا آزاد کی اس صدا کو دل کی آواز قرار دے کر اسے سراہا۔ شیخ الہند حرمین اور استنبول کے سفر پر نہ جاتے، جس کے نتیجہ میں آپ کی اسارت مالٹا کا مرحلہ پیش آیا، تو اسی وقت اس جماعتی نظم کا اہتمام ہو جاتا لیکن تقدیر الٰہی غالب آکر رہی، پھر جمعیۃ علماء ہند کی موجودگی کے بغیر قائم ہوئی تو اس میں اس انداز کا خیال نہ رکھا گیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی پہلے اجلاس (امرتسر) کے صدر تھے دوسرا اجلاس شیخ الہند کی صدارت میں دہلی میں ہوا اور اسی وقت اس حوالہ سے گفتگو ہی نہیں ہوئی بلکہ ایک کمیٹی قائم ہو گئی جس نے "امارت شرعیہ" کا مسودہ تیار کیا، جس کی تفصیل "جمعیۃ علماء ہند" نامی کتاب میں موجود ہے۔ شیخ الہندؒ کی اس حیثیت کو مولانا احمد رضا خان کے گھرانے کے علاوہ ہندوستان کی ہر علمی تحریک و شخصیت تسلیم کرتی تھی لیکن ان کی صحت کا حال پتلا تھا تو مولانا ابوالکلام، جنہیں شیخ الہند چاہتے تھے وہ "معاصرت" کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اور ملک گیر سطح پر یہ منصوبہ پروان نہ چڑھ سکا۔ تاہم صوبہ بہار" اس معاملہ میں خوش قسمت ہے کہ اس نے اولیت کا شرف حاصل کیا اور صوبائی سطح پر اس میں یہ نظم قائم ہوا جس کے

روحِ رواں مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمہ اللہ تعالیٰ تھے جو کچھ عرصہ مرکزی طور پر جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ بہار کی امارتِ شرعیہ کا سلسلہ اب تک قائم ہے بلکہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اور اس سے ملتِ اسلامیہ کو بے پناہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے، آج کل اس کے "امیرِ شریعت" ہمارے فاضل گرامی مولانا منت اللہ ہیں جو خلف الرشید ہیں مولانا محمد علی مونگیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے، جو بانی ہیں ندوۃ العلماء کے اور جن کی روحانی نسبت اویسی زمانہ مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمہ اللہ تعالیٰ سے تھی۔ "امارت" کا ترجمان پندرہ روزہ "نقیب" جو پھلواری شریف سے نکلتا ہے۔ مولانا منت اللہ کے کرم سے برابر موصول ہو رہا ہے، جس سے اس کے پھیلتے ہوئے سلسلہ کا علم ہوتا ہے اور اب پورے ہندوستان میں ایک احساس ہے کہ اس کا دائرہ پورے ملک پر پھیلایا جائے۔ مسلمانوں کے عائلی مسائل اور ایسی بہت سی چیزیں امارت سے متعلق ہیں۔ جس دور میں صوبائی سطح پر بہار میں امارت کا سلسلہ قائم ہوا اسی دور میں پنجاب میں بھی اس کا اہتمام ہوا۔ مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ جو براہِ راست شیخ الہند کے فیض یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ، شیخ الہند کے خصوصی معتمد مولانا سندھی کے عزیز و خادم تھے، ان کی انجمن خدام الدین کے اجتماع ۱۹۲۶ء میں اس کا اہتمام ہوا۔ روحِ رواں شیخ الہند کے شاگردِ رشید مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے تو امیرِ شریعت بنایا گیا۔ السید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ جیسے خطیب العصر، نابغہ اور عبقری انسان کو۔ لاہور کی فضائیں اس واقعہ کو کیسے بھولیں گے کہ دیوبند کا محدثِ کبیر پانچ سو علماء کی موجودگی میں السید بخاری کے ہاتھ پر امیرِ شریعت کی بیعت کر رہا ہے اور پھر اس کی قیادت میں پانچ صد علماء بھی بیعت کرتے ہیں جن میں پانچواں نمبر مولانا سید محمد یوسف بنوری کا تھا۔ مولانا ظفر علی خان اور مولانا لاہوری بھی شامل تھے۔

یہ امارت کا قیام اور بیعت کا اہتمام محض کوئی حادثہ تھا؟ بالکل نہیں۔ یہ اسی سلسلہ کی صدائے بازگشت تھی لیکن پنجاب کے مخصوص سیاسی حالات اور امیرِ شریعت کی ہنگامہ خیز زندگی نے بہار کی طرح اس سلسلہ کو یہاں منظم نہ ہونے دیا تاہم شاہ جی نے ایک قافلہ ترتیب دے کر پنجاب کی سیاست کا رخ بدلا۔ قادیانیت اور اس قسم کے ناسور ختم کرنے کی سعی کی اور سب سے بڑھ کر پنجاب کے پس ماندہ علاقوں میں اصلاحِ عقائد و معاشرت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں خودداری اور حریت کی روح پھونکی۔

اس نظام کے احیاء کی ایک اور کوشش جمعیۃ علماء اسلام کے اندر ہوئی لیکن یہ ایسا واقعہ ہے جس کا کوئی ذکر تذکرہ نہیں ملتا۔ جمعیۃ علماء اسلام سے متعلق ہم اپنے سلسلہ مضامین میں اپنے احساسات و تاثرات اور اس جماعت کی نسبت سے اپنی حقیر خدمات کا ذکر کر چکے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد مولانا محمد صادق مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی، مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی، مولانا گل بادشاہ طور و مردان اور مولانا عبدالواحد خطیب گوجرانوالہ رحمہم اللہ تعالیٰ، جمعیۃ علماء ہند کی طرز پر جمعیۃ علماء پاکستان کی تشکیل چاہتے تھے۔ یہ سب حضرات قافلہ شیخ الہند کے رفیق دیرینہ اور مضبوط کردار و سوچ کے مالک تھے۔ لیکن مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی خواہش تھی کہ دیوبند کی علمی تحریک کی دوسری شاخ "جمعیۃ علماء اسلام" سے ہی مل کر کام کیا جائے تاکہ اس ملک کا مقصد وجود آسانی سے پورا ہو سکے۔ اسی لئے باہم تعاون کا سلسلہ ہوا۔ لیکن ۱۹۵۶ء تک کے حالات کو دیکھ کر مجبوراً جمعیۃ کی نشاۃ ثانیہ کا اہتمام کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء تک جتنا پانی سروں سے گذر چکا تھا۔ اس کا اندازہ ہر باشعور انسان کو ہے، اس لئے علماء کو حالات کی اصلاح اور گاڑی کے رُخ کو موڑنے کے لئے شدید جد و جہد کرنا پڑی اور معاملہ جوں کا توں ہے۔

۱۹۵۸ء میں دوسری مرتبہ ملک میں مارشل لاء لگا۔ پہلا مارشل ۱۹۵۳ء کا تھا۔ جب قادیانیوں کو تحفظ دینے کے لئے مسلم لیگ کے اہل سیاست نے، سیاسی اور سول حکومت کے باوصف جزوی طور پر مارشل لاء کا سہارا لے کر فدائین ختم نبوت کو خاک و خون میں تڑپایا۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے دوران ہی مولانا لاہوری دنیا سے رخصت ہو گئے تو حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستی کا ایسے وقت میں ان کے جانشین کے طور پر اعلان کیا گیا جب وہ حرمین شریفین میں تھے۔ اس مرد درویش اور قلندر انسان کی خدمات ملی کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی ذات اب بھی نقطۂ اتحاد بن سکتی ہے بشرطیکہ حادثات کی پیداوار لوگ ضد و تعصب کا رویہ چھوڑ دیں ـــــ ہمیں یاد ہے اور جمعیۃ کے ذمہ دار لوگ یقیناً اس کی تائید کریں گے کہ مولانا عبدالواحد جیسے منجھے ہوئے مخلص عالم نے ایک نہایت ہی نازک موقع پر جماعت کو اس طرف توجہ دلائی کہ وہ ماضی کی طرف پلٹے، مغربی انداز سیاست سے بالاتر ہو کر امارت اور بیعت کا طریقہ اپنائے۔ اور مولانا درخواستی جو جماعت کے امیر ہیں، چونکہ وہ ہر اعتبار سے اہل ہیں اس لئے ان کے ہاتھ پر بیعت کا سلسلہ اپنا کر اس جد و جہد کو وہ رُخ دیا جائے جس کے نتیجہ میں اصلاح کا کام آسان ہو سکے ـــــ مولانا کے بقول یہ راہ کٹھن تھی لیکن مردان حُر کا ایک قافلہ ان اصولوں پر مرتب ہو جائے تو پھر خطرات کی برداشت آسان ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ مولانا کی بات نہ چل سکی اور ملک کے مخصوص حالات نے اہل دین و اہل علم کو بھی مغربی انداز سیاست اور طریق تنظیم کار سیاسیا بنا کر رکھ دیا۔

اب یقین ہو جانا چاہیئے کہ اگر اصلاح کی شکل ممکن ہے تو اسلام کے انقلابی انداز و طریق پر، ورنہ مغربی انداز فکر کے برگ و بار بتا رہے ہیں کہ کل کلاں یہاں اسلام کا نام کوئی نہ لے گا ـــــ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس انداز کو اپنانے کے لئے فکر مند ہیں اور اس رُخ پر آغاز کار کر چکے ہیں تو اس پر لعنت

کے حوالے سے یا ان کے مستند عالم نہ ہونے کے حوالے سے بحث و جرح کے بجائے اس انداز کی علمی افادیت اور تاریخی حیثیت کا لحاظ ضروری ہے اور امید ہے کہ اہلِ علم اپنے مضمون کو اس انداز سے مرتب کریں گے ـــــ ہماری دلچسپی اگر ہے تو بس یہی، واللہ علیٰ ما اقول وکیل ۔

ہماری ذمہ داریاں

اب جو کہنا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں نہ تو خلافت کا ادارہ قائم ہے نہ وہ قدآور شخصیات ہیں جو اپنی ذات میں انجمن ہوا کرتی تھیں اور بقول مولانا شبلی جہاں بیٹھ جائیں، انجمن فراہم کر لیتیں۔ برِّعظیم کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں مسلمان کبھی بھی اکثریت میں نہ تھے، ہمیشہ ان کا معاملہ "اقلیت" کا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء تک بہرحال وہ برسرِ اقتدار رہے، اس طویل دور میں اگر ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں تو بھلائی اور خوبی کے کام بھی بہت ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد نقشہ پلٹا، کل کے حاکم، محکوم اور مقہور بن گئے، ان پر جو ظلم ہوئے ان کا ٹھکانہ ہے نہ حد، حتیٰ کہ جدید سیاسی نظریات کے حوالہ سے انہیں وسیع دھرتی کے بجائے سکڑنا اور سمٹنا پڑا۔ متحدہ ہندوستان ـــــ اور تقسیم ہندوستان کے دو موقف تھے کس کا غلط تھا کس کا صحیح، اس تلخ بحث کی ضرورت نہیں۔ تاریخ اس کا خود فیصلہ کر دے گی۔ اس کا انتظار کرنا چاہئے۔ لیکن تقسیم کے بعد جو خطہ ہمیں ملا اور جن عزائم اور مقاصد کے تحت ملا، اس کے حوالے سے اور اللہ تعالیٰ کے دین کے حوالہ سے ہماری جو ذمہ داریاں ہیں، ان کا احساس ضروری ہے۔ آدھا ملک جا چکا، باقی جس صورتِ حال کا شکار ہے وہ آپ گذشتہ ماہ کے میثاق میں ڈاکٹر صاحب کی بعض تحریرات کے حوالہ سے دیکھ لیں۔ گو کہ ان میں اکثر تحریرات پرانی ہیں لیکن آج کے حالات پر اسی طرح فٹ بیٹھتی ہیں۔ ان حالات سے نکلنے کی سبیل اور شکل ایک ہی ہے کہ "ایفائے عہد" کی فکر کی جائے ـــــ وہ عہد جو اللہ تعالیٰ سے کیا تھا اور جو اس کی مخلوق سے کیا تھا ـــــ میرے یا کسی کے لئے یہ فیصلہ آسان نہیں کہ وہ کہے کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط، ہاں یہ تو ممکن ہے کہ آدمی دیانت داری سے جو سچ اور صحیح سمجھے اس کے لئے فکر کرے۔ اہلِ دین کی یہی بنیادی ذمہ داری ہے۔

دوسرے اداروں اور تحریکات کے بارے میں طرزِ عمل کیا ہو؟

مولانا علی میاں کا ایک مضمون "الفرقان" کے اسی شمارے میں جس کا حوالہ پہلے آیا، چھپا، عنوان ہے: "دوسرے دینی اداروں اور تحریکوں کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل"۔ اس سے خوب رہنمائی ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے:

دین کا جو حصہ ہم تک پہنچا اس کی دو قسمیں ممکن ہیں۔ خاص ہیئت و شکل کے ساتھ پہنچنے والا حصہ اور وہ حصہ جس میں نفسِ شئی تو مطلوب ہے لیکن اس کی خاص شکل متعین نہیں،

پہلے حصہ کی مثال نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں تو دوسرے کی مثال جہاد فی سبیل اللہ، دعوت الی اللہ وغیرہ......... لہٰذا دعوت دین کا کام کرنے والے ہر فرد یا جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے جو طریقہ دعوت صحیح جانے وہ مقرر کرے اور اپنی تحریک کا جو طرز کار مناسب سمجھے وہ اختیار کرے، اسمیں کسی کو جائز یا ناجائز کہنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں۔

اس وقت عام طور پہ دین کے ان دونوں حصوں کو خلط ملط کیا جاتا ہے۔ منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دیدیا جاتا ہے۔ اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پہ پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مشکلات پیدا ہوگئی ہیں اور مختلف اداروں اور تحریکوں میں اکثر تنازعہ کی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ اگر ہم ان دونوں چیزوں میں فرق سمجھ لیں تو بہت سی مشکلات حل ہوجائیں گی، سینکڑوں تنازعوں کا سدباب ہو جائے گا اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

(صفحہ ۱۲۰-۱۱۸)

اہلِ دین کے راستے کے پتھر!! مادہ پرستی، آخرت کی بے وقعتی، مصروفیت کا عذر، اہلِ دین کی کمزوری، دینی تحریکوں کی ناکامی اور داعیوں کے تلخ تجربات، مسلمانوں کا من حیث القوم افسردہ خاطر اور شکستہ دل ہونا اور عقائد کا اختلاف اور بدگمانیاں یہ ہیں وہ اسباب و موانع جو اس وقت دعوت و اصلاح و تبلیغ کے راستے میں سنگ گراں ہیں، ان بھاری پتھروں کے ہوتے ہوئے اہلِ دین و اصلاح اگر آپس میں الجھیں گے اور بھڑیں گے تو نتیجہ معلوم ——!

اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے اندر سب سے پہلے روحانیت اس طرح پیدا ہو کہ مادیت دب کر رہ جائے۔ یہ دونوں معاملات یعنی مادیت کا دب جانا اور آخرت کی وقعت پیدا ہو جانا لازم و ملزوم ہیں۔ جب یہ ہو جائے گا تو مصروفیت کا عذر خود بخود ختم ہو کر رہ جائے گا، آج یہ عذر اس لئے ہے کہ دین اور اس کی قدریں ثانوی درجہ رکھتی ہیں۔ جب ان کا درجہ اولین ہو جائے گا اور آخرت کا احساس پیدا ہو جائے گا تو پھر اس عذر سے کوئی کام نہ لے گا۔ اور اسی سے رفتہ رفتہ سب اسباب دور ہو جائینگے۔

حرفِ آخر سب سے اہم بات جس کی طرف اس وقت توجہ دلانا مقصود ہے وہ ہے بدگمانیوں کا معاملہ۔ آج اہلِ دین، اس نوع کی جماعتوں اور تحریکوں میں یہ مرض سب سے زیادہ ہے۔ حالانکہ اسلام اس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہتا ہے۔ وہ بدگمانی کو حرام قرار دیتا ہے، وہ بلاتحقیق کسی بات کا شیوع ناجائز کہتا ہے، وہ ہر بات کی تصدیق پہ زور دیتا ہے اور بغیر تصدیق بات کہنے والے کو جھوٹا کہتا ہے۔ اس لئے اگر ایک کی بات دوسرے کی سمجھ میں آجائے تو

بسم اللہ۔ نہ آئے تو اپنے اپنے راستہ پر کام کرتے چلے جائیں۔

غلطیوں اور گناہوں سے کوئی پاک نہیں۔ نبوت کے ساتھ عصمت کا معاملہ بھی رسول کریم علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان کی جماعت معصوم نہ تھی محفوظ ضرور تھی۔ ان کے بعد کسی کے لئے ایسا معاملہ بھی نہیں، اس لئے حزم، احتیاط اور تقویٰ کی صفات کے ساتھ سفر حیات جاری رکھنے کی ضرورت ہے ورنہ بدگمانیوں کی فصل کے سبب انسان کے مفلس و قلاش ہونے کا خطرہ ہے۔ جس کا مفہوم حدیث میں یہ ہے کہ ایک آدمی نماز روزہ وغیرہ تو بہت لے کر صبح قیامت میں حاضر ہوگا لیکن لوگوں کے بے حد تقاضوں کے سبب اس کی نیکیاں تو انہیں تقسیم ہو جائیں گی اور پھر جو بوجھ باقی رہے گا وہ ان کے گناہوں کو اس پر لاد کر دور کیا جائے گا اور پھر اس کا نتیجہ ــــــ؟ تصور سے آدمی کانپ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ہیں جو اس برے انجام سے بچانے والے ہیں۔

امید کہ باتمکین قارئین، میرے مخلص کرم فرما، بزرگ، احباب اور دوست ٹھنڈے دل سے میری گذارشات کو پڑھ کر اپنی مناسب رائے سے آگاہ فرمائیں گے۔ تاکہ میں اپنی غلطیوں کی اصلاح کر سکوں۔ ہاں اگر کسی کو خیر کا پہلو نظر آئے تو اس سے ہاتھ بٹانے کی درخواست ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ ۔ (آمین)

استدراک

اس مضمون میں چودہ صدیوں کے "رجال دین" کی جو مختصر فہرست چھپی ظاہر ہے وہ نامکمل ہے، میں نے اس کے متعلق خود تصریح کر دی تھی۔ اسکے باوجود بعض احباب نے بعض ایسے حضرات کے اسماء گرامی کی طرف توجہ دلائی جو اس فہرست میں شامل ہونے ضروری تھے۔ اس سلسلہ میں محترم ڈاکٹر انوار احمد صاحب عباسی کلینک لاہور کا بے حد شکر گذار ہوں کہ انہوں نے "صاحب کشف المحجوب" حضرت الشیخ السید علی ہجویری لاہوری، مولانا محمد الیاس کاندھلوی بانی جماعت و تحریک تبلیغ، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بلکہ ان کا پورا خاندان، جس نے انگریز کے خلاف نہ صرف باقاعدہ جہاد کیا بلکہ علمی میدان میں وسیع خدمت سرانجام دیں، رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی کی طرف توجہ دلائی، ایسے اہم حضرات کے ناموں کا رہ جانا خود میرے لئے افسوس کا باعث ہے۔ اس فروگذاشت پر اللہ تعالیٰ سے معافی کا طالب ہوں۔

رپورتاژ

ہندوستان میں پندرہ دن

عاکف سعید

دوسرے دن یعنی ۲۱ نومبر کو صبح نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ایک چکر لگایا۔ اولیاء کرام میں حضرت خواجہ نظام الدینؒ کا جو مرتبہ و مقام ہے وہ کسی بھی دینی ذوق رکھنے والے شخص سے پوشیدہ نہیں، لیکن دیگر مزاروں کی طرح وہاں بھی جہلاء کے غلط طرزِ عمل کے باعث شرک و بدعت کے گہرے سائے نظر آئے جس سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوئے بجلت میں وہاں سے نکلے، واپس آئے تو مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کو حالتِ انتظار میں موجود پایا۔ مولانا موصوف کے ایک داماد اسی بستی میں اقامت پذیر ہیں۔ مولانا نے بتایا کہ ہمیں ناشتہ کے لئے انکے ہاں جانا ہے۔ تعمیلِ حکم میں مولانا کے ساتھ چل پڑے اور ان کے ساتھ ناشتہ کیا۔

آگے بڑھنے سے قبل یہ وضاحت کرتا چلوں کہ ابتداءً دہلی میں زیادہ دیر قیام کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ والد صاحب نے بھارت کے سفر کا جو شیڈول مرتب کیا تھا اس کے مطابق ہمیں ۱۸ نومبر کو دہلی پہنچ کر صرف دو دن کے بعد لکھنؤ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اور وہاں مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی صحبت میں چند دن گذار کر ۲۵ کو حیدر آباد پہنچنا تھا۔ جہاں ۲۶ اور ۲۷ کو یوم رحمۃ للعالمینؐ اور یوم صحابہؓ کے اجتماعات سے والد محترم کو خطاب کرنا تھا ـــــ لیکن عین وقت پر ویزا نہ ملنے کے باعث لکھنؤ کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ نتیجتہً دہلی میں قیام کے لئے ہمیں خاصا وقت مل گیا ـــــ محترم والد صاحب کا خیال تھا کہ اس وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی میں موجود علماء سے رابطہ قائم کیا جائے اور کچھ گھوم پھر کر دلی شہر خصوصاً پرانی دلّی اور اس کے قدیم دروازوں کے محل وقوع کا اندازہ قائم کیا جائے ـــــ

چنانچہ ناشتہ کے بعد مولانا اخلاق حسین صاحب مدظلہٗ کے ساتھ یہ پروگرام طے پایا کہ ہم دن کے ۱½ بجے تک جامعہ رحیمیہ پہنچ جائیں گے۔ باقی دن کا پروگرام وہیں طے ہوگا ـــــ حسب پروگرام مدرسے پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا ناسازیٔ طبع کے باعث تشریف لے جا چکے ہیں ـــــ دوپہر کے کھانے کے لئے جناب شیر میوات نے روک لیا۔ نماز ظہر کے بعد ہم مدرسے سے نکلے اور شہر کا قصد کیا۔

مولانا عطاء الرحمٰن ہمراہ تھے۔ سب سے پہلے ہم چتلی قبر میں جماعت کے مرکزی دفتر میں پہنچے۔ امیر جماعت کے سوا جماعت کے دیگر سرکردہ افراد موجود تھے۔ والدِ محترم وہیں مرکز میں ٹھہر گئے جبکہ میں مولوی عطاء الرحمٰن شہر گھومنے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے۔ طے یہ پایا کہ آج دہلی کا لال قلعہ دیکھا جائے۔ یہ قلعہ مخصوص مغلیہ طرز کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اور لاہور کے شاہی قلعے کے مقابلے میں زیادہ کشادہ اور نسبتاً بہتر حالت میں ہے۔ میرا گمان ہے کہ شہر لاہور کی مغلیہ دور کی یادگار عمارات کو سکھا شاہی دور میں جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا دہلی کی عمارات اس قسم کے نقصان سے محفوظ رہنے کے باعث مجموعی طور پر بہتر حالت میں ہیں[1]۔ مغرب کے بعد ہم نے قلعہ میں Light and Sound (روشنیوں اور آوازوں کا) پروگرام بھی دیکھا۔ جس کے ذریعے لال قلعے کی ماضی قریب تک کی تاریخ کا ایک بھرپور خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ اس پروگرام کو آپ کسی تاریخی کہانی پر مبنی ایک ریڈیو ڈرامے سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ ڈرامہ شاہی قلعے کے مرکزی لان میں بیٹھ کر سنا جاتا ہے اور مزید رنگ آمیزی کے لیے کرداروں کی آوازوں کے ساتھ قلعے کا متعلقہ حصہ روشنی سے منور کر دیا جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک مفید پروگرام تھا اور میرا احساس ہے کہ کہیں بھی کسی تاریخی حقیقت کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تاہم تعصب کی جھلک کہیں کہیں محسوس ہوئی۔

رات کے کھانے کے لئے ہم مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب مدظلہ کے بڑے صاحبزادے کے ہاں مدعو تھے۔ موصوف دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے استاد (پروفیسر) ہیں، نہایت قابل آدمی ہیں۔ تاریخ اور ادب سے خصوصی شغف ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہی دو عنوانات زیادہ تر گفتگو کا موضوع رہے۔ دسترخوان پر دہلی کی مسلمان ثقافت اور روایتی مہمان نوازی کے متعدد مظاہر دیکھنے میں آئے۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ نظام الدین واپسی ہوئی۔

اگلے دن یعنی ۲۲ نومبر کو جمعہ سے قبل کا کوئی پروگرام طے نہیں تھا۔ تاہم خطابِ جمعہ کے لئے مولانا اخلاق حسین صاحب نے پہلے ہی سے محترم والد صاحب کو پابند کر لیا تھا جس کے لئے دوپہر ایک بجے تک ہمیں دہلی کی مشہور تاریخی مسجد 'حسین بخش' پہنچنا تھا[2]۔ چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق محترم ظفر الاسلام

---

[1] واضح رہے کہ لاہور کی بادشاہی مسجد اس وقت جس حالت میں ہے وہ ایک بھرپور مرمت کے عمل (Renovation) کا نتیجہ ہے۔ ورنہ سکھوں نے اسے جس حالت میں پہنچا دیا تھا اس کا اندازہ اس دور کی بعض تصاویر سے بخوبی ہو جاتا ہے جو ابھی تک محفوظ ہیں۔ اور بادشاہی مسجد کے مرکزی دروازے کے اندر آویزاں ہیں۔

[2] پچھلی قسط میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ یہ وہی مسجد ہے جس میں سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب ایک عرصہ خطبہ دیتے رہے۔ جو اپنی سحر آفریں خطابت کے باعث بہت بلند نام رکھتے تھے۔ آج کل یہاں مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی خطابت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

صاحب ۱۱ بجے ہمیں لینے کے لئے تشریف لے آئے ترکمان گیٹ پر انہوں نے گاڑی پارک کی اور وہاں سے مسجد حسین بخش تک رسائی کے لئے سائیکل رکشہ کو ذریعہ بنانا پڑا۔ محترم والد صاحب نے سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات کو خطبے کا موضوع بنایا اور ماہ ربیع الاوّل سے ربط قائم کرتے ہوئے ان تین آیات کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے تین ادوار کا بڑے عمدہ انداز میں تذکرہ فرمایا چالیس منٹ کا یہ خطاب نہایت جامع اور مؤثر رہا۔

نماز جمعہ کے بعد مولانا قاسمی مدظلہ ہمیں صحن مسجد سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ جہاں معززین اہل محلہ جمع تھے۔ اندازہ ہوا کہ جمعہ کے بعد تھوڑی دیر کے لئے یہاں ٹھہرنا مولانا کے معمولات میں شامل ہے۔ مولانا نے حاضرین کا تعارف کرایا اور چائے کے ایک دور کے بعد یہ روایتی مجلس برخاست ہوئی۔ واپسی پر مولانا عطاء الرحمٰن ہمارے ساتھ ہو لئے ——— دہلی میں قیام کے دوران دیگر تاریخی عمارات دیکھتے ہوئے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ بھارت آنا ہی ہوا ہے تو تاج محل بھی دیکھنا چاہیئے چنانچہ محترم والد صاحب کی اجازت اور مولانا اخلاق حسین صاحب کے مشورے سے میں نے مولوی عطاء الرحمٰن کے ہمراہ آگرہ جانے کا پروگرام بنالیا تھا اور اس کے لئے ۲۳ تاریخ کی صبح کے لئے تاج ایکسپریس میں دو سیٹیں بھی ریزرو کرالی تھیں ——— بستی نظام الدین یعنی ہماری قیام گاہ سے نیو دہلی ریلوے اسٹیشن کا فاصلہ بہت زیادہ تھا جبکہ جامعہ رحیمیہ اسٹیشن کے بالکل پڑوس میں واقع ہوا تھا۔ اور ٹرین کی روانگی کا وقت صبح ۷ بجے کا تھا۔ لہٰذا ہم نے مناسب یہی خیال کیا کہ رات جامعہ رحیمیہ میں گذاری جائے تاکہ صبح سٹیشن پہنچنے میں سہولت ہو۔ چنانچہ جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب میں نے مولوی عطاء الرحمٰن صاحب کے ہمراہ جامعہ میں بسر کی۔

اگلی صبح ہم بروقت اسٹیشن پہنچ گئے۔ نیو دہلی ریلوے اسٹیشن غالباً انڈیا کے انتہائی مصروف اور وسیع و عریض اسٹیشنوں میں سے ہے۔ پیشگی ریزرویشن کے باعث سیٹیں حاصل کرنے میں قطعاً دقت پیش نہیں آئی۔ دہلی سے آگرہ ۱۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ٹھیک سات بجے ٹرین روانہ ہوئی اور تین گھنٹے میں یعنی ۱۰ بجے ہم آگرہ پہنچ گئے۔ آگرہ اور اس کے مضافات میں یوں تو متعدد تاریخی مقامات قابل دید ہیں لیکن ہمارا ارادہ صرف تاج محل اور آگرہ کا قلعہ دیکھنے کا تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم شام تک واپس دہلی پہنچ جائیں۔ اسٹیشن سے ہم نے آٹو رکشا حاصل کیا اور پہلے شاہی قلعے پہنچے۔ یہ قلعہ دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ گو اس کا رقبہ دہلی کے لال قلعہ کے مقابلے میں کچھ کم ہے۔ لیکن بلند و بالا عظیم الشان عمارتوں کی بہتات کے باعث اسے اگر لال قلعہ دہلی سے برتر اور بہتر قرار دیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ مغل بادشاہ

شاہ جہاں کی مستقل سکونت یہیں پر تھی اور تعمیراتی معاملے میں شاہ جہاں کا ذوق کسی سے ڈھکا چھپا نہیں چنانچہ یہاں کی عمارتوں میں شاہجہاں کا مخصوص تعمیراتی ذوق بصراحت نمایاں نظر آتا ہے شاہجہاں کی نظر بندی کے ایام بھی اسی قلعے میں گزرے اور یہیں اس کی وفات ہوئی تھی۔ مقامی گائڈوں نے ہمیں وہ سرنگ بھی دکھائی جس کے ذریعے سے شاہجہان کی لاش کو قلعے سے تاج محل تک لے جایا گیا اور ممتاز محل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ قلعے کا ایک حصہ جو شاید فوج کے رہنے کے لئے مخصوص تھا بالکل کھنڈر بن چکا تھا۔ اور وہاں اب آمد و رفت نہ ہونے کے باعث بندروں نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ بہرحال جہاں ان عمارات کو دیکھ کر ایک جانب مغلیہ دور کی عظمت و سطوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہیں دوسری جانب عبرت بھی ہوتی ہے کہ انسان اپنی چند سالہ زندگی اور اپنے جھوٹے وقار کے لئے کیا کچھ کر گزرتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس دنیاوی زندگی کے لئے بقا نہیں ہے بلکہ فنا ہی اس کا مقدر ہے۔ چنانچہ لَا یُرٰی اِلَّا مَسَاکِنُھُمْ کے مصداق یہ بلند و بالا اور مضبوط عمارات بھی اپنے مکینوں سے خالی نظر آئیں۔

دریائے جمنا قلعے کے مشرقی جانب بہتا ہے اور دریا ہی کے کنارے پر قلعے سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر وہ عظیم الشان عمارت ہے جو بلاشبہ فنِ تعمیر کا ایک لازوال اور لاثانی شاہکار ہے۔ یعنی تاج محل! چنانچہ قلعے کی مشرقی جانب سے تاج محل کا منظر بہت خوبصورت ہے۔ قلعے میں غیر ملکی سیاحوں کی کثرت تھی۔ اور وہ سب مختلف زاویوں سے تاج محل کے اس دیدنی منظر کو اپنے کیمروں میں محفوظ کرنے کی فکر میں ہے ——— قلعے کی بھرپور سیر سے فارغ ہو کر ہم تاج محل پہنچے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تعریف میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگرچہ تاج محل کی تصاویر بارہا نگاہ سے گذری تھیں لیکن قریب سے دیکھنے پر اسے تخیل سے زیادہ حسین پایا۔ وہ عمارت بلاشبہ حسن و جمال کا ایک نادر مرقع ہے۔ سرتاپا سنگِ سفید، جو غالباً سنگ مرمر کی کوئی خاص قسم ہے سے تعمیر شدہ اس عمارت پر جب سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی نہایت خوبصورت ہیرا جگمگا رہا ہے۔ تاج محل کا ماحول بھی بہت خوبصورت ہے اور اگرچہ اس کی تعمیر کو لگ بھگ چار صدیاں بیت چکی ہیں اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اتنے عرصے میں تو کوئی دریا متعدد بار اپنا راستہ (B E D) تبدیل کر چکا ہوتا ہے لیکن شاید دریائے جمنا بھی اس کی خوش گوار قربت سے محروم نہیں ہونا چاہتا اور بدستور اس کے پہلو میں بہہ رہا ہے ——— شام کو ہم نے واپسی کا قصد کیا۔ واپسی کے لئے اگرچہ ریزرویشن نہیں تھا تاہم جھیلم ایکسپریس میں جگہ مل گئی۔ دہلی پہنچ کر مولوی عطاء الرحمٰن تو جامعہ رحیمیہ روانہ ہو گئے اور میں نے "المرکز الاسلامی" کا رُخ کیا۔ وہاں مولانا وحید الدین خاں صاحب اور ان کے صاحبزادے

ڈاکٹر ثانی اشنین سے ملاقات ہوئی ۔ جو اس اثنا ء میں اپنے سفر سے واپس تشریف لا چکے تھے ۔

اتوار ۲۴ نومبر کے اہم پروگراموں میں جامعہ رحیمیہ میں والد صاحب کا درس قرآن شامل تھا جس کے لئے تین بجے بعد دوپہر کا وقت طے کیا گیا تھا ـــــ صبح کا وقت ہمارے پاس فارغ تھا۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے سوچا کہ آج جامع مسجد کے سامنے بازار میں دینی کتب ورسائل کی دکانوں کا دورہ کیا جائے ۔ اس لئے کہ ہمیں بعض ایسی کتابوں کی تلاش تھی جن کی فرمائش ہمارے بعض احباب نے کی تھی ـــــ ہم دلّی کے مشہور بازار " چاندنی چوک " کی طرف سے شہر کے اندر داخل ہوئے ۔ میرے لئے اس طرف آنے کا یہ پہلا موقعہ تھا ۔ چاندنی چوک کو اگر لاہور کی انار کلی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا ۔ اتوار کی عام تعطیل کے باعث بازار بند تھے تاہم تہہ بازاری جوبن پر تھی اور خوب گہما گہمی تھی ۔ چاندنی چوک کے علاقے سے گذر کر آگے بڑھے تو تقریباً وسطِ شہر میں فتح پوری مسجد کو اپنے سامنے پایا ۔ یہ وسیع و عریض تاریخی مسجد مغلیہ دور کی یادگار ہے اور پرانے شہر کے قلب میں واقع ہے ۔ اسی مسجد میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی پر قاتلانہ حملے کی ناکام سازش ہوئی تھی ۔ مسجد کی اندرونی دیواریں فارسی اشعار سے مزیّن تھیں ۔ انہی اشعار کے ذریعے یہ اندازہ ہوا کہ لگ بھگ سوا سو سال قبل یہ مسجد بھرپور مرمّت (Renovation) کے عمل سے گذاری گئی ہے ۔ تاہم یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اوّلاً اس کی تعمیر کب ہوئی تھی ! ـــــ وہاں سے بذریعہ سائیکل رکشہ پل بنگش کی طرف گئے ۔ جہاں ایک گلی میں محترم والد صاحب نے مجھے اپنے ماموں جی کا وہ مکان دکھایا جہاں تقسیم ہند سے قبل انہیں متعدد بار ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا ـــــ ہماری اگلی منزل جامع مسجد تھی ۔ جہاں ہمیں کتابوں کی مارکیٹ میں کچھ وقت گذارنا تھا ۔ لیکن وہاں پہنچے تو مارکیٹ کو بند پایا ۔ تاہم اس دوران قدیم دہلی کے ان گلی کوچوں کو دیکھنے کا بھرپور موقع مل گیا جن کے بارے میں کبھی غالب نے کہا تھا ؎

دلّی کے نہ کوچے تھے اوراقِ مصوّر تھے
جو چیز نظر آئی ، تصویر نظر آئی

اور ذوقؔ نے اپنے تأثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا ؎

" کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر ! "

بہرحال دلّی کے وہ گلی کوچے جو کبھی ایک عظیم تہذیب و تمدّن اور ثقافت کا گہوارہ تھے ، اس وقت بہت مختلف حالت میں نظر آئے ۔ اب ہر گلی کوچہ بلکہ ہر ہر گھر کاٹیج انڈسٹری کا یونٹ بن چکا ہے ۔ کہیں پریس لگا ہوا ہے تو کہیں خراد کی مشین ہے اور کہیں خام چاندی کو زیورات کی شکل میں ڈھالا جا رہا ہے تو کہیں بیکری کا سامان تیار ہو رہا ہے ۔ وقس علیٰ ذٰلک ـــــ نمازِ ظہر ہم نے جامعہ

رحیمیہ پہنچ کر ادا کی حسبِ اعلان تین بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ مدرسہ کے طلبہ اور معزز اساتذہ کے علاوہ شہر سے بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد درسِ قرآن سننے کے لئے جمع تھی۔ محترم والد صاحب کے خطاب سے قبل صدرِ مدرس مولانا محمد نعیم صاحب مدظلہٗ نے نہایت جامع طور پر مدرسہ کا تعارف کرایا۔ محترم والد صاحب کا تعارف کراتے ہوئے مولانا موصوف نے فرمایا "اگرچہ ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف پرانا نہیں ہے تاہم ان کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ نہایت سلجھے ہوئے انسان ہیں اور دین کے معاملے میں وسیع القلب ہیں اور یہی وسیع القلبی دراصل خاندانِ ولی اللّٰہی کا طرۂ امتیاز ہے!"

محترم والد صاحب نے درس کے لئے سورۃ الصف کی مرکزی آیت: "هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ٥" کا انتخاب کیا۔ اور اس کے حوالے سے تکمیلِ رسالت کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت سے روشنی ڈالی۔ دورانِ درس والد صاحب نے بتایا کہ وہ اس مقام پر (یعنی جامعہ رحیمیہ میں) سورۃ الصف کی اس مرکزی آیت کا درس دیتے ہوئے خصوصی مسرّت اور انشراحِ صدر محسوس کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اسی مدرسہ کے احاطے میں مسجد سے بالکل ملحق حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مرقد ہے اور شاہ صاحبؒ ہی نے اس آیۂ مبارکہ کی خصوصی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے پورے قرآن کا 'عمود' قرار دیا تھا ـــــ درس ۱½ گھنٹے جاری رہا ـــــ درس کے بعد مدرسے کے مہتمم مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ نے والد محترم کو جامعہ کی دستارِ فضیلت عطا کی۔ یہ گویا اعزازی سندِ فراغت تھی جو والدِ محترم کو ان کی دینی خدمات کے اعتراف کے طور پر اور قرآن مجید سے خصوصی شغف رکھنے کی بنا پر عطا کی گئی ـــــ نمازِ عصر کے بعد شہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ چائے کا دَور چلا۔ اور بعد نمازِ مغرب ہم بستی نظام الدین واپس آگئے۔ اپنے مستقر یعنی 'المرکز الاسلامی' پہنچے تو وہاں مولانا وحید الدین خاں صاحب اپنے ماہانہ درسِ قرآن کی نشست میں اپنے حالیہ بیرونی سفر کے تاثرات بیان فرما رہے تھے۔ اس طرح مولانا کے درس میں شمولیت کا موقع بھی مل گیا۔ اپنی گفتگو کے اختتام پر مولانا نے فرمایا کہ دعوت کے میدان میں مسلمانوں کا انداز بہت غلط رہا ہے۔ داعی کو صلح و آشتی کا علمبردار ہونا چاہیئے نہ کہ تصادم کا! مولانا نے اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ دین کا غلبہ صرف صلح ہی کے راستے سے ممکن ہو سکتا ہے۔ تصادم کی پالیسی غلبۂ دین کے راستے کی بڑی رکاوٹ ہے! مولانا نے اپنے موقف کی تائید میں صلح حدیبیہ کے واقعے کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ صلح ہی فتح کا پیش خیمہ بنی۔ مدینہ میں کفار سے تصادم شروع ہوا جو چھ برس جاری رہا۔ لیکن حضورؐ نے یہ اندازہ فرماتے ہوئے کہ اس

راستے سے ہم اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔ صلح کا راستہ اختیار فرمایا جو فتح مکہ پر منتج ہوا۔
مولانا نے اپنی گفتگو مکمل کرنے کے بعد محترم والد صاحب کو دعوت خطاب دی۔ والد صاحب نے معمولی پس وپیش کے بعد اسے قبول کر لیا اور سورۃ صف کی اسی آیت کو اپنی گفتگو کا عنوان بنایا جس کا درس جامعہ رحیمیہ میں دیا تھا۔ تکمیلِ رسالت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی فرمانے کے بعد والد صاحب نے مولانا وحید الدین خاں صاحب کے فکر پر واشگاف الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے یہ بتایا کہ غلبۂ دین کے کام کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ 'دعوت' کا ہے اور دوسرا 'اقامت' کا ہے۔ دعوت کے مرحلے کی حد تک مولانا کا موقف صد فی صد درست ہے اور داعی کا جو کردار مولانا نے متعین فرمایا ہے وہ واقعتہً اس مرحلے کے تقاضوں سے کامل ہم آہنگی رکھتا ہے۔ لیکن 'اقامتِ دین' کے مرحلے کے تقاضے بالکل جدا ہیں۔ یہاں نظام کو بدلنا پیشِ نظر ہوتا ہے۔ لہٰذا تصادم ناگزیر ہوتا ہے۔ والد صاحب نے واضح الفاظ میں یہ کہا کہ جس شخص کا بھی یہ خیال ہے کہ غلبۂ دین کا کام تصادم کے بغیر ممکن ہے وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہے اس لئے کہ اگر اس کا کوئی امکان ہوتا تو کم از کم سیرتِ مطہرہ میں اس کی نوبت نہ آتی۔ لیکن وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ رحمۃ للعالمینؐ کو کفار سے پے بہ پے کئی جنگیں لڑنی پڑیں۔ صلح حدیبیہ کے واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے محترم والد صاحب نے فرمایا کہ صلح ہمیشہ ایسے دو فریقوں کے مابین ہوتی ہے جو قوت وطاقت میں ہم پلّہ ہوں۔ اور اگر متعدد غزوات کے ذریعے مسلمانوں نے اپنی طاقت منوا نہ لی ہوتی تو مشرکینِ مکہ ہرگز صلح پر آمادہ نہ ہوتے اور صلح کوئی مقصود بالذات شے نہیں تھی بلکہ وقتی مصلحت کے پیشِ نظر حضورؐ نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو سال بعد جب ایک موقع پر کفار نے صلح کو منسوخ کر دیا۔ اور پھر جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے چاہا کہ صلح کی تجدید ہو جائے اور ابوسفیانؓ[1] نے جو اس وقت قریشِ مکہ کے سردار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تجدیدِ صلح پر آمادہ کرنے کے لئے ہر ممکن جتن کئے لیکن حضورؐ نے صلح کی تجدید نہیں کی اور ابوسفیانؓ کو ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لئے کہ حضورؐ یہ اندازہ فرما چکے تھے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کفار میں اب دم خم باقی نہیں ہے چنانچہ اس موقع پر صلح کی تجدید کا مطلب کفار کو مہلتِ تازہ (Fresh Lease of Existance) دینا تھا۔ اور حضورؐ کے پیشِ نظر غلبۂ دین کا جو کام تھا اس کے اعتبار سے کفار کو بلاوجہ مہلت دینے کا کوئی جواز

---

[1] حضرت ابوسفیانؓ اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے

نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے نہ صرف یہ کہ تجدید صلح سے انکار کیا بلکہ آگے بڑھ کر آپؐ نے اقدام فرمایا اور دس ہزار کا لشکر لے کر مکّے کی جانب کوچ فرمایا جس کے نتیجے میں مکّہ فتح ہوا۔ حاضرینِ مجلس نے، جو تعداد میں بیس[۲] سے زائد نہ تھے، پوری توجہ اور دلچسپی سے دونوں نقطہ ہائے نظر کو سنا اور نماز عشاء پر یہ محفل برخاست ہوئی۔

اگلے دن یعنی ۲۵ نومبر کی شام کو حیدر آباد دکن کے لئے روانگی تھی۔ دن کے اوقات میں ہمارے ساتھی اقبال پٹیل صاحب نے بعض احباب کے اصرار پر SIM (سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ) کے مرکز میں ایک پروگرام ترتیب دیا تھا جس میں والد صاحب کو طلبہ کے سوالات کے جوابات دینے تھے۔ اقبال پٹیل صاحب شکاگو میں تنظیم میں شامل ہوئے تھے۔ آپ کا تعلق احمد آباد (انڈیا) سے ہے۔ نہایت سرگرم دینی کارکن ہیں۔ والد صاحب کی انڈیا آمد کی جب انہیں اطلاع ملی تو ملاقات کے لئے دہلی آ گئے اور کئی دن ہمارے ساتھ رہے ـــــ پروگرام کے مطابق ہم صبح ساڑھے دس بجے اوکھلا میں SIM کے مرکز پہنچے۔ یہ دراصل اسلامی جمعیت طلبہ کے طرز پر ایک طلبہ آرگنائزیشن ہے جو کبھی جماعت اسلامی ہند سے منسلک تھی۔ لیکن اب یہ جماعت سے کٹ چکی ہے۔ اور بالکل آزاد تنظیم ہے۔ SIM کے سرکردہ افراد کے علاوہ 'انصار'[۱] کی اچھی خاصی تعداد مرکز میں جمع تھی۔ ۲ گھنٹے تک بھرپور نشست رہی جس میں ابتداءً والد صاحب نے اسلام کے ہمہ گیر احیائی عمل کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا اور پھر حاضرین کے سوالات کے تسلّی بخش جوابات دیئے۔ البتہ اس سوال کے جواب میں کہ "ہندوستان میں دین کا کام کرنے کے لئے آپ ہمیں کیا مشورہ دیں گے؟" والد صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے چونکہ یہاں کے حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ لہٰذا میں اس سلسلے میں سرِدست آپ کو کوئی مشورہ دینے سے قاصر ہوں۔"

یہاں سے فارغ ہو کر ہم پولیس اسٹیشن سے ہوتے ہوئے، جہاں ہم نے اپنی روانگی کا اندراج کرایا، جامعہ رحیمیہ پہنچے اور کچھ دیر یہاں ٹھہرنے کے بعد ائرپورٹ کا رُخ کیا جہاں سے ہمیں حیدر آباد دکن کے لئے فلائٹ پکڑنی تھی۔

شیڈول کے مطابق ہمیں ۸ بجے شب حیدر آباد پہنچنا تھا لیکن فلائٹ میں تاخیر کے باعث ہم ۹ بجے حیدر آباد پہنچ سکے۔ ائرپورٹ پر مجلس تعمیرِ ملّت کے سرکردہ افراد اور قرآن اکیڈمی حیدر آباد

---

[۱] SIM کے ارکان کے لئے 'انصار' کی اصطلاح وضع کی گئی!

سے وابستہ حضرات کی ایک بڑی تعداد نے نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا[1] ہمارے محترم دوست اور رفیق جناب حیدر محی الدین غوری صاحب حیدرآباد میں ہمارے قیام کے انچارج تھے۔ غوری صاحب نے اپنے چچازاد بھائی کے نئے تعمیر شدہ مکان میں ہمارے قیام کا اہتمام کیا تھا اور وہ خود بھی ہمہ وقت ہمارے ساتھ مقیم تھے۔ مولانا قاری عبدالعلیم صاحب کی جائے رہائش بھی ہماری قیام گاہ سے نزدیک تھی چنانچہ ان کی بھرپور معیت بھی ہمیں پورے قیام حیدرآباد کے دوران حاصل رہی۔

اگلے روز یعنی ۱۲ ربیع الاوّل (۲۶ نومبر) کو وہ مرکزی اجتماع تھا جس کے لئے یہ تمام سفر اختیار کیا گیا تھا۔ کل ہند مجلس تعمیر ملّت کے زیر اہتمام "یوم رحمۃ للعالمین" کا یہ اجتماع بلاشبہ شرکاء کے ذوق وشوق اور تعداد حاضرین کے اعتبار سے ایک منفرد شان کا حامل ہوتا ہے اور غالباً پورے عالم اسلام میں سیرت کے موضوع پر اتنے عظیم الشان اجتماع کی کوئی اور نظیر موجود نہیں ہے۔ یہ اجتماع صبح ۹ بجے سے نماز ظہر تک جاری رہتا ہے اور ظہر بالعموم تاخیر سے پڑھی جاتی ہے۔ محترم والد صاحب کو چونکہ مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا تھا اور آپ کا خطاب ہی اس اجتماع کا مرکزی خطاب تھا لہٰذا ۱۲½ بجے کا وقت آپ کے خطاب کے لئے معین کیا گیا۔ پروگرام کے مطابق ہم ۱۱½ بجے جلسہ گاہ میں پہنچے۔ مدرسۂ اعزہ کے وسیع وعریض گراؤنڈ میں پنڈال سجایا گیا تھا۔ انتظامات قابل رشک تھے۔ جلسہ گاہ تک پہنچنے والی تمام سڑکیں گویا مسلمانوں کی تحویل میں تھیں۔ پورا پنڈال حدّ نگاہ تک حاضرین سے پُر تھا۔ سٹیج سے کچھ دور دائیں جانب خواتین کے لئے اہتمام تھا اور قناتوں کا ایک طویل سلسلہ مردوں اور خواتین کے مابین حائل تھا۔ گو جلسہ گاہ میں اب مزید گنجائش باقی نہیں رہی تھی پھر بھی جلسہ گاہ کے انتہائی کناروں پر مسلسل حرکت کی کیفیت اس بات کی غمّاز تھی کہ شائقین کی آمد ہم جاری ہے۔ چنانچہ بعد میں معلوم ہوا کہ آس پاس کی گلیاں بھی شرکاء کی کثرت کے باعث جلسہ گاہ کا حصّہ بن چکی تھیں۔ محترم والد صاحب کے خطاب سے قبل کئی مقررین کے نام لسٹ میں شامل تھے۔ سب سے پہلے جناب

---

[1] استقبال کرنے والوں میں نواب شاہ عالم خاں صاحب (صدر مجلس استقبالیہ مجلس تعمیر ملّت)، سلیمان سکندر صاحب (کارگذار صدر مجلس تعمیر ملّت)، رحیم قریشی صاحب (جنرل سیکرٹری)، لائق علی صاحب (نائب سیکرٹری) کے علاوہ قاری عبدالعلیم صاحب (صدر قرآن اکیڈمی حیدرآباد) اور سید قطب الدین علی چشتی صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔

باقر آغا صاحب نے خطاب کیا۔ موصوف کا تعلق اہلِ تشیع سے تھا۔ موصوف کی تقریر پر مخصوص کلامی رنگ غالب تھا جس میں بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ اصطلاحات کا کثرت سے استعمال اور الٹ پھیر تو واضح تھا لیکن صورتِ واقعہ اس مصرعہ کے مصداق تھی کہ ع "مُعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا" ان کے بعد حافظ قاری تقی الدین صاحب کا عالمانہ خطاب ہوا۔ آپ کا موضوع تھا "شریعت کا مقام" جس کے حوالے سے آپ نے مسلم پرسنل لاء کے مسئلے پر مفصّل بحث کی۔ بعد ازاں پی ایل او کے نمائندے جناب خالد الحسین نے خطاب فرمایا اور منتظمینِ جلسہ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کے بعد جناب نظام الدین مغربی صاحب کو دعوتِ خطاب دی گئی، موصوف حیدر آباد کے معروف دینی سکالر ہیں، لیکن مغربی صاحب نے کمال ایثار سے کام لیتے ہوئے اور وقت کی کمی کے پیشِ نظر خطاب سے گریز کیا اور سٹیج پر آ کر صرف اتنا کہا کہ میں اپنا وقت مہمان مقرر کو دیتا ہوں! اس پر لوگوں نے اس درجہ مسرّت کا اظہار کیا کہ جلسے کے مزاج کے برخلاف تالیاں تک بجا دی گئیں۔ محترم والد صاحب کے خطاب سے قبل جناب رحیم قریشی صاحب، سیکرٹری مجلسِ تعمیرِ ملّت، نے جناب خلیل اللہ حسینی صاحب کا پیغام پڑھ کر سنایا جو مجلسِ تعمیرِ ملّت کے صدر اور بانی ہیں اور کسی بیرونی سفر کے باعث اجتماع میں شریک نہ تھے ـــــ محترم والد صاحب کا خطاب ایک بجے کے بعد شروع ہو سکا۔ آپ نے سب سے پہلے حیدر آباد کے مسلمانوں کو اس عظیم الشان جلسے کے انعقاد پر مسلمانانِ پاکستان کی جانب سے ہدیۂ سلام اور ہدیۂ تبریک پیش کیا اور مسلمانانِ حیدر آباد کی غیرت و حمیّتِ دینی کو خراجِ تحسین پیش کیا پھر آپ نے " وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ " سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اس نکتے کو وضاحت سے بیان کیا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم فی الواقع تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آئے تھے اور یہ آپؐ کی رحمت ہی کا مظہر ہے کہ آپ نے نوعِ انسانی کو وہ تین تحفے دیئے ہیں جو ویسے تو ہر دور میں انسان کی ضرورت رہے ہیں لیکن خصوصاً اس دور میں نوعِ انسانی ان کی احتیاج کو شدّت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ ان میں سے پہلی ضرورت کا عنوان ہے "علم حقیقت یا حقیقت کی تلاش" جو ہمیشہ سے فلسفے کا موضوع رہا ہے کہ اس کائنات اور خود انسان کی اصل حقیقت کیا ہے؟ زندگی اور موت کی حقیقت کیا ہے؟ خیر کیا ہے شر کسے کہتے ہیں؟ وغیرہ! اس پہلو سے جو تحفہ حضور اکرمؐ نے نوعِ انسانی کو دیا ہے وہ ہے " الھدٰی " یعنی قرآن حکیم! ے

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمینؐ

دوسری ضرورت جو نوعِ انسانی کو درپیش ہے 'اجتماعی اخلاق' کی ہے۔ اور

حضورؐ کی شان یہ تھی کہ "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاق"۔ کہ میں تو مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں ۔ انفرادی طور پر اخلاق کے بڑے بڑے کوہ ہمالہ تو پہلے بھی موجود رہے ہیں لیکن حضورؐ کی ذات میں تمام محاسن و اوصاف نہایت حسین توازن کے ساتھ جمع ہو گئے تھے اور اس ضمن میں نوعِ انسانی کے لئے آپ کا اصل تحفہ 'اجتماعی اخلاق' ہے ــــ تیسری چیز جس کی ضرورت اس دور میں شدّت سے محسوس کر رہی ہے وہ ہے ایک ایسا اجتماعی نظام جس میں ہر سطح پر عدل و انصاف ہو۔ چنانچہ تیسرا تحفہ جو آپ نے نوعِ انسانی کو عطا کیا وہ ہے 'دینِ حق' یا 'نظامِ عدلِ اجتماعی' ! یہ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پر محیط تھی جسے سامعین نے پوری توجہ اور دلچسپی سے سنا ــ تین بجے یہ جلسہ برخاست ہوا ــــــ اختتام پر سٹیج سیکرٹری نے آج کے جلسے کو نہایت کامیاب قرار دیتے ہوئے بتایا کہ اس بار حاضری معمول سے زیادہ تھی اور محتاط اندازے کے مطابق شرکاء کی کم از کم تعداد کا اندازہ دو لاکھ کا ہے جس میں لے حصّہ یعنی لگ بھگ پچاس ہزار کی تعداد خواتین پر مشتمل ہے اور واقعتہً یہ ایک غیر معمولی بات تھی ــــــ شام کو ہم مجلس تعمیرِ ملّت کے صدر استقبالیہ جناب نواب شاہ عالم خاں صاحب کے ہاں عشائیہ پر مدعو تھے۔ اس عشائیے میں مقررینِ جلسہ اور مجلس تعمیرِ ملّت کے تمام سرکردہ افراد کے ساتھ ساتھ معززینِ شہر کی بھی ایک بڑی تعداد کو مدعو کیا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ ضیافت حیدر آبادی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور ان کے ذوقِ اکل و شرب کا ایک نفیس مرقع تھی ۔

اگلے دن یعنی ۱۷ نومبر کو نماز فجر کے بعد قاری عبدالعلیم صاحب ہمیں اپنے دولت کدے پر لے گئے۔ معلوم ہوا انہوں نے اچھے خاصے ناشتے کا اہتمام کیا ہوا ہے ۔ ان کی محبّت اور خلوص کے سامنے انکار کی جرأت کسے ہو سکتی تھی ! ــــــ صبح ۹ بجے کا وقت ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی صاحب سے ملاقات کے لئے طے تھا ۔ قاری صاحب حیدر آباد کی ایک بزرگ علمی شخصیت ہیں خصوصاً حیدر آباد میں فن قرأت کے فروغ میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ آج کل آپ ضعیف العمری کے باعث گوشہ نشین ہیں۔ محترم والد صاحب کے دروسِ قرآن کے کیسٹ سنے تو ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ والد صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے خود قاری کلیم اللہ حسینی سے ملاقات کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا ۔ چنانچہ ۹ بجے ہم قاری صاحب کے یہاں پہنچے تو وہ نہایت محبّت سے ملے اور اپنی کئی تصانیف محترم والد صاحب کو عنایت فرمائیں ! ــــــ

لے ۱۷ نومبر کے اخبارات میں جلسے کی جو رپورٹنگ ہوئی اس میں شرکاء کی تعداد چار لاکھ بتائی گئی۔ تاہم محتاط ترین اندازے کے مطابق کم از کم تعداد بھی ۲ لاکھ سے زائد بنتی ہے ۔

قبل ازظہر کل ہند مجلس تعمیرِ ملّت کے کارگذار صدر جناب سلیمان سکندر صاحب، جنرل سیکرٹری جناب رحیم قریشی صاحب اور جائنٹ جنرل سیکرٹری جناب میر لائق علی صاحب محترم والد صاحب سے ملاقات کیلئے ہمارے مستقر یعنی محترم حفیظ غوری صاحب کے مکان پر تشریف لائے۔ ہمیں گذشتہ روز کے جلسے سے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ تینوں حضرات مجلس تعمیرِ ملّت کے اہم عہدیدار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت سرگرم کارکن بھی ہیں اور واقعتہً پوری لگن اور خلوص سے مسلمانانِ ہند کی بھلائی کے لئے کوشاں ہیں۔

یہ حضرات بہت دیر تک محترم والد صاحب کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ اس نشست میں تفصیل سے امّتِ مسلمہ کی مجموعی صورتِ حال، دینی جماعتوں کے طریق کار، اسلامی انقلاب کا صحیح نہج اور بھارت میں دین کا کام کرنے کے امکانات جیسے اہم موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

آج شام بھی مجلس تعمیرِ ملّت کے زیرِ اہتمام ایک اہم جلسہ تھا۔ گذشتہ روز یعنی ۱۲ ربیع الاوّل کے جلسے کا عنوان تھا "یوم رحمۃ للعالمین" اور آج یعنی ۱۳ ربیع الاوّل کے جلسے کو "یوم صحابہؓ" کا عنوان دیا گیا تھا۔ مجلس کے صدر جناب سلیمان سکندر صاحب نے بتایا کہ مؤخر الذکر جلسے کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ پہلے صرف ۱۲ ربیع الاوّل کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ البتہ گذشتہ تین چار سال سے 'یوم صحابہؓ' کے جلسے کا انعقاد بھی کیا جا رہا ہے۔ اور اس میں بھی بالعموم ۵۰ ہزار سے زائد افراد شریک ہوتے ہیں۔ اس سال 'یوم صحابہؓ' کے جلسے کے مرکزی مقرر بھی محترم والد صاحب تھے۔ ہم رات نماز عشاء کے بعد جلسہ گاہ پہنچے تو حاضری کا نقشہ لگ بھگ وہی پایا جس کا مشاہدہ ایک دن قبل ہوا تھا[1]۔ وہی مدرسہ اعزہ کا وسیع و عریض گراؤنڈ، وہی عظیم الشان پنڈال اور وہی تاحدِ نگاہ ہجومِ شائقین! محترم والد صاحب کی تقریر سے قبل مولانا عبدالحی ارشد منوری، جناب اعظم علی صوفی صاحب نے خطاب کیا اور مزید برآں علی گڑھ یونیورسٹی کے قاضی عبدالستار صاحب نے حضرت خالد ابن ولیدؓ کی سیرت اور کارناموں پر ایک نہایت محققانہ مقالہ پیش کیا۔ محترم والد صاحب نے اپنے خطاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر انقلابی جدوجہد میں صحابہ کرامؓ کے انتہائی جاں نثارانہ کردار پر نہایت مؤثر انداز میں روشنی ڈالی۔ تقریر رات کے ۱ بجے شروع ہوئی تھی، ماحول بھی پُرسکون تھا اور محترم والد صاحب کا جوشِ خطابت بھی اپنے عروج پر تھا۔ واقعتہً ایک سماں بندھ گیا تھا۔ ۱½ گھنٹہ پر محیط اس خطاب نے مجمع کو اس طور سے اپنے اندر جذب کیا ہوا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا گویا لوگ سانس

---

[1] بعد میں معلوم ہوا کہ اس مرتبہ 'یوم صحابہؓ' کے جلسے کی حاضری بھی ۱½ لاکھ سے متجاوز تھی اور یہ غیر معمولی بات یہ تھی اس لئے کہ عموماً 'یومِ صحابہ' کے جلسہ میں پہلے دن کے مقابلے میں نصف حاضری ہوا کرتی ہے یعنی لگ بھگ پچاس ہزار!

روکے یہ خطاب سن رہے ہیں ـــــ آخری تقریر مولانا حمید الدین عاقل حسامی کی تھی۔ مولانا موصوف حیدرآباد کے معروف علماء میں سے ہیں اور اپنی خوش گفتاری کے باعث نہایت مقبول ہیں۔ چنانچہ مولانا کی زبان کی مٹھاس اور بھرپور دوران تقریر برجستہ چٹکلوں سے لطف اندوز ہونے کا ہمیں بھی موقعہ ملا ـــــ کل کی طرح آج بھی جلسہ کے اختتام پر مجمع محترم والد صاحب سے مصافحہ کے لئے امڈ پڑا۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بہرحال حیدرآباد میں ہمارے میزبان محترم حفیظ غوری صاحب نے پہلے ہی اہتمام کرلیا تھا کہ اپنی گاڑی کو سٹیج کے عقب میں بالکل نزدیک لے آئے اور اس طرح ان کی فراست نے ہمارے لئے جلسہ گاہ سے نکلنا ممکن بنادیا۔

۲۸ر نومبر کو دن کا زیادہ حصہ ہم نے آرام کیا۔ دوپہر کے کھانے کے لئے ہم محترم امجد اللہ صاحب (آئی اے ایس ریٹائرڈ) کے یہاں مدعو تھے۔ بعد نماز عشاء جامع مسجد معظم پورہ (ملّے پلی) میں محترم والد صاحب نے حسب اعلان درس قرآن دیا اور سورۃ حٰم السجدہ کی چھ آیات کے حوالے سے 'دعوت الی اللہ' کے موضوع پر اس طور روشنی ڈالی کہ موضوع سے متعلق تمام گوشے روشن ہوگئے۔ لگ بھگ ۱½ گھنٹوں پر محیط اس درس کو مسجد میں موجود تقریباً ایک ہزار سامعین نے نہایت توجہ اور دلجمعی سے سنا۔

۲۹ر نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ ناشتہ کے لئے حیدر محی الدین غوری صاحب نے اپنے گھر پر مخصوص اہتمام کیا تھا۔ قبل جمعہ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت مجلس تعمیر ملت کے صدر اور بانی جناب خلیل اللہ حسینی صاحب سے ملاقات کے لئے طے تھا۔ ملاقات کے وقت کارگذار صدر جناب سلمان سکندر صاحب بھی ہمارے تھے۔ حسینی صاحب سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ۱۲ر ربیع الاوّل کے موقع پر حسینی صاحب اپنے ضعیف العمری اور علالت کے باوصف اورنگ آباد میں ایک جلسے میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ دورانِ گفتگو یہ اندازہ ہوا کہ مجلس تعمیر ملت کے زیر اہتمام یہ تمام سرگرمی درحقیقت ان ہی کے "نفسِ گرم" کی بدولت ہے۔ گو فالج کے حملے کے باعث انہیں بولنے میں دشواری پیش آرہی تھی اور الفاظ بھی صاف نہ تھے تاہم ان کے قریبی لوگ بات سمجھ لیتے تھے اور اس طرح communication ممکن تھی۔ حسینی صاحب کا شمار بلاشبہ ان معدودے چند لوگوں میں ہوتا ہے جو قوم وملت کے درد میں اس طرح بے چین ہوتے ہیں کہ پھر تعمیر ملت ہی ان کی زندگی کا مشن بن جاتی ہے اور اس راہ کی کوئی رکاوٹ انہیں اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی سے نہیں روک سکتی ـــــ دورانِ ملاقات یہ احساس بھی ہوا کہ فکری سطح پر ان کے اور والد صاحب کے درمیان گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ موجودہ دینی جماعتوں کے بارے میں ان کی سوچ اور والد صاحب کی فکر میں کامل مطابقت محسوس ہوئی۔ اسی طرح صدر ضیاء اور پاکستان میں اسلامائزیشن کے معاملے میں خلافِ توقع[1] ان کی رائے والد صاحب کے تجزیے سے کامل ہم آہنگ تھی۔

ـــــــ

(حاشیہ [illegible])

جمعہ کا خطاب جامعہ مسجد معظم پورہ میں تھا جس میں محترم والد صاحب نے سورۃ الجمعہ کی آیت ۲ [۱] کو موضوع بناتے ہوئے یہ واضح کیا کہ دعوتِ دین کا مرکز و محور دراصل قرآن مجید ہی ہے۔ یہ خطاب بھی نہایت مؤثر اور مدلل تھا۔ مغرب سے کچھ پہلے ہم 'مسقط ہوٹل' کے ارادے سے نکلے جس کی افتتاحی تقریب کے لئے محترم والد صاحب کو بطور مہمان خصوصی دعوت دی گئی تھی۔ یہ ہوٹل دراصل حیدر آباد میں ہمارے ایک کرم فرما جناب ابراہیم بن عبداللہ مسقطی (ایم ایل اے) کی ملکیت ہے جو وہاں ایک معروف شخصیت ہیں اور خوش مزاج طبیعت کے مالک ہیں۔ محترم والد صاحب سے انہیں خصوصی محبت ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے اس بار اس شکل میں کیا کہ اپنے نئے ہوٹل کا افتتاح محترم والد صاحب سے کرایا! ــــ نمازِ عشاء معظم پورہ کی مسجد میں پڑھی اور نماز کے بعد حسب پروگرام والد صاحب نے درس قرآن دیا۔ آج کا موضوع تھا "اقامتِ دین"، سورۃ الشوریٰ کی تین آیات کی روشنی میں اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ مسلسل مصروفیت کے باعث آغاز میں طبیعت پر اضمحلال نمایاں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ طبیعت کھلی اور ۲½ گھنٹے یوں گذر گئے کہ احساس تک نہ ہوا۔ غایت درجہ انہماک کے باعث پوری تقریر کے دوران مجمع پر بھرپور سکوت طاری رہا۔

اگلی صبح ۳ نومبر کو محترم جناب قطب الدین علی چشتی صاحب کی دعوت پر ان کے مدرسہ 'انوار الہدیٰ' جانا ہوا۔ محترم چشتی صاحب نے نہایت پُرتکلف ناشتہ کرایا۔ وہیں سے ہم نے غوری برادران کی معیت میں zoo کا ایک ہلکا پھلکا چکر لگایا جو مدرسہ سے بہت قریب تھا ــــ پروگرام کے مطابق نمازِ ظہر میں ہمیں مولانا حمید الدین عاقل صاحب کی دعوت پر ان کے مدرسہ 'دار العلوم' میں پہنچنا تھا۔ اگرچہ وہاں پہلے سے خطاب کا کوئی پروگرام طے نہیں تھا لیکن وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مدرسہ کے چار سو طلبہ اور دیگر مہمان محترم والد صاحب کو سننے کے لئے انتظار میں ہیں۔ چنانچہ نمازِ ظہر کے بعد والد صاحب نے اپنے خطاب میں امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے حوالے سے امت کے فرضِ منصبی پر روشنی ڈالی۔ مختصر سے وقت میں یہ مدلل خطاب نہایت جامع اور مؤثر رہا۔ بعد ازاں مولانا عاقل نے ہمیں اپنے مدرسے کی نئی عمارت کا دیدار کرایا۔ جہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا

مغرب کے بعد مدینہ پبلک اسکول کے ہال میں محترم والد صاحب کی تقریر کا پروگرام تھا۔ بعض احباب کی خواہش پر محترم والد صاحب نے "ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت" کے موضوع کو اپنی

---

[۱] ہندوستان کے مسلمان عام طور پر پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق صاحب کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید صدر ضیاء کی کوششوں سے پاکستان میں واقعتہً اسلام کا نفاذ ہو گیا ہے۔ اور یہ نافہمی دراصل دونوں ملکوں کے مابین ذرائع ابلاغ (communication) کے فقدان کے باعث ہے

تقریر کا عنوان بنایا اور اس ضمن میں سورۃ الصف کی آیت ۹ کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ اور واقعتہً موضوع کا حق ادا کر دیا۔ آج کے اجتماع میں حیدر آباد شہر کے اعلیٰ تعلیمیافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ کثرتِ حاضرین کے باعث ہال کی تنگ دامانی عیاں تھی۔ تقریر کے خاتمے پر ایک صاحب نے کھڑے ہو کر صدرِ مجلس سے یہ مطالبہ کیا کہ آج کی تقریر کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے جس کی تائید تمام حاضرین نے کی۔

یکم دسمبر ہمارا حیدر آباد میں آخری دن تھا۔ یہ دن بھی نہایت مصروف گذرا۔ فجر کے بعد جناب حفیظ غوری صاحب کے مکان پر تنظیم اسلامی کے رفقاء کا اجتماع ہوا ـــ دس بجے محترم والد صاحب نے قرآن اکیڈمی حیدر آباد کے نئے دفتر[1] کا افتتاح کیا اور وہیں سوال و جواب کی ایک نشست ہوئی جس میں ۲۰-۲۲ افراد نے شرکت کی۔ اس موقع پر یہ فیصلہ ہوا کہ ہمارے حیدر آباد کے ساتھی آئندہ سے قرآن اکیڈمی کا نام بجائے "انجمن خدام القرآن" کے نام سے ادارہ چلائیں گے۔

ـــ آج دن میں محترم والد صاحب کی ملاقات مولانا صبغت اللہ بختیاری صاحب سے بھی ہوئی جن کا شمار حیدر آباد کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ رات بعد نماز عشاء سکندر آباد کی جامع مسجد میں خطاب ہوا۔ جہاں لگ بھگ دو ہزار افراد کے مجمع کے سامنے والد محترم نے سیرت النبیؐ کی روشنی میں انقلاب کے مختلف مراحل کو وضاحت سے بیان فرمایا۔ اس طرح حیدر آباد میں ہمارا پروگرام مکمل ہوا[2]۔

شدید نا انصافی ہو گی اگر ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے قیام حیدر آباد کے دوران ہمیں آرام پہنچانے کے لئے اپنا دن رات ایک کر دیا تھا۔ ان میں سر فہرست ہیں جناب حیدر محی الدین غوری صاحب جو اس پورے عرصے کے دوران سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہے اور ہماری ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا بھی بدرجۂ آخر خیال رکھا۔ محی الدین غوری صاحب اگرچہ عمر میں میرے والد کے برابر ہیں لیکن وہ مجھ سے اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے ہم عمر دوست! انھوں نے ہمیں اتنی محبت اور خلوص دیا کہ میں اپنے قیامِ حیدر آباد کو ان کی خوشگوار رفاقت کے باعث اپنی زندگی کے یادگار دنوں میں شمار کرتا ہوں۔ انہی کے نام کے ساتھ آتا ہے جناب حفیظ غوری صاحب کا جو حیدر محی الدین غوری صاحب کے چچازاد

---

[1] ہمارے محترم رفیق جناب حیدر محی الدین غوری صاحب نے اپنی دکان " غوری آپٹیکل کمپنی کی اوپر کی منزل میں یہ دفتر بنایا ہے اور اس بلڈنگ کی ایک پوری منزل اسی مقصد کے لئے وقف کر دی ہے۔

[2] یہ رپورتاژ اس اعتبار سے تشنہ ہے کہ اس میں حیدر آباد شہر کے بارے میں کوئی تعارفی بات نہیں آسکی۔ دراصل 'میثاق' کے صفحات اس رپورٹ کی طوالت کے متحمل نہیں ہو رہے تھے۔ لہٰذا اختصار سے کام لینا پڑا۔ (مرتب)

بھائی ہیں اور پلاسٹک کے سامان کا بزنس کرتے ہیں۔ حیدر آباد میں ہمارا قیام انہی کے مکان پر تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا۔ ان کی کار مسلسل ہمارے استعمال میں رہی اور ان کا پورا وقت بھی گویا ہمارے Disposal پر تھا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بھائیوں کو بہترین جزا عطا فرمائے ـــــــ مزید برآں قاری عبدالعلیم صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی مشفقانہ معیت بھی ہمیں مسلسل حاصل رہی جس کے باعث حیدر آباد میں قیام کا لطف دوبالا ہو گیا ـــــــ اسی طرح قرآن اکیڈمی اور تنظیم اسلامی سے متعلق تمام حضرات نے ہمارے قیام حیدر آباد کے دوران نہایت سرگرمی اور خلوص سے کام کیا جس پر ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔[1]

۲ دسمبر کی صبح کو ہم قیام حیدر آباد کی بہت سی خوش گوار یادوں کو سمیٹتے ہوئے دہلی واپس آ گئے حسب توقع مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ والد صاحب کو مولانا سے ملاقات کا بہت اشتیاق تھا۔ چنانچہ اس طرح ملاقات ممکن ہو جانے پر انہیں بہت مسرت ہوئی۔ دہلی میں دوران قیام والد محترم کی مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے ملاقات کی دو نشستیں ہوئیں۔ ایک ۲ دسمبر کو بعد نماز مغرب اور دوسری ۳ دسمبر بعد نماز فجر، مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کی برکت سے ایسے متعدد دیگر اکابرین سے ملاقات کا موقع بھی مل گیا جن سے ملاقات کی والد محترم شدید خواہش رکھتے تھے۔ میری مراد مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا افتخار فریدی اور ڈاکٹر اشتیاق احمد سے ہے جو سب اس موقع پر دہلی میں موجود تھے۔ اور ہمیں ان سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔

۳ دسمبر کی رات کو مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدظلہ نے بعض مقامی دوستوں کے اصرار پر پہاڑی بھوجلہ کے علاقہ میں والد محترم کا ایک پروگرام طے کیا تھا جس میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر والد صاحب کو خطاب کرنا تھا۔ یہ قیام ہندوستان کے دوران ہمارا آخری پروگرام تھا ـــــــ اگلی صبح یعنی ۴ دسمبر کو علی الصبح ۷ بجے کی فلائٹ سے ہم بخیر و عافیت لاہور واپس آ گئے۔

اٰیِبُوْنَ تَآئِبُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ!

---

[1] ان میں محترم حیدر محی الدین غوری صاحب کے بڑے فرزند جناب شاہد صاحب کا نام قابل ذکر ہے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اجتماعات سے متعلق انتظامی امور میں بھرپور حصہ لیا بلکہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر حیدر آباد شہر کی سیر بھی خوب کرائی۔

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 35	FEBRUARY 1986	No. 2

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

5-C, 5th FLOOR, SIDCO EVENUE CENTRE
264-R. A. LINES, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEPHONE : 870512 880731